# ذوق اردو

05-31-2017

# فہرست


**انٹرٹینمنٹ**

انگلش و نگلش ..... ۱
بے چین ..... ۲
پرلطف ترین شخص ..... ۵

**سائنس / ٹیکنالوجی**

کمپیوٹر وائرس ..... ۶

**صحت**

دس نکاتی صحت بخش منشور ..... ۷

**کاروبار**

مربوط ترقی کا راز ..... ۸
معاشی سفر کے تضادات ..... ۹

**کھیل**

ایتھلیٹکس ..... ۱۱
سائیکلنگ ..... ۱۳
فٹ بال کے فکس میچ ..... ۱۵

**معاشی**

خواتین کا عالمی دن ..... ۱۷
صنعتی و معاشی حب ..... ۱۸
کرپشن کی سماجی وجوہات ..... ۲۰

# انگلش و نگلش

مصنف: یوسف اقبال

مجھے بچپن سے ہی انگریزی میں فیل ہونے کا شوق تھا لہذا میں نے ہر کلاس میں اپنے شوق کا خاص خیال رکھا۔ ویسے تو مجھے انگریزی کوئی خاص مشکل زبان نہیں لگتی تھی ، بس ذرا سپیلنگ ، گرائمراور Tenses نہیں آتے تھے۔ مجھے یاد ہے جو ٹیچر ہمیں کلاس میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے وہ بھی کاٹھے انگریز ہی تھے، دو سال تک ''سی۔۔۔یو ۔۔۔پی۔۔۔''سپ'' پڑھاتے رہے، مشین کو ''مچین''اور نالج کو ''کنالج'' کہتے رہے۔

ایسی تعلیم کے بعد میری انگریزی میں اور بھی نکھا ر آگیا، مجھے یاد ہے میٹرک کے داخلہ فارم میں جب ایک کالم میں ''Sex '' لکھا ہوا تھا تو میں کافی دیر تک شرماتے ہوئے سوچتا رہا کہ ایک لائن میں اتنی لمبی تفصیل کیسے لکھوں؟؟؟ فارم کے پہلے کالم میں اپنا نام انگریزی میں لکھنا تھا لیکن انگریزی سے نابلد ہونے کی وجہ سے مجھے یہ نام لکھنے کے لیے اسلام آباد کا سفر کرنا پڑا کیونکہ فارم پر لکھا ہوا تھا''Fill in capital ''۔

انگریزی فلمیں دیکھتے ہوئے بھی مجھے کہانی توسمجھ آجاتی تھی، سٹوری پلے نہیں پڑتی تھی۔سکس ملین ڈالر مین ، نائٹ رائڈر، چیپس، ائیر وولف اور کوجیک جیسی مشہورِ زمانہ فلمیں میں نے صرف اور صرف اپنی ذہانت سے سمجھیں اور انجوائے کیں۔

آج سے کچھ سال پہلے تک مجھے یقین ہوچکا تھا کہ میں فارسی، عربی ، پشتو اور اشاروں کی زبان تو سیکھ سکتا ہوں لیکن انگریزی نہیں،لیکن اب جو حالات چل رہے ہیں اُن کو مدنظر رکھ کر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یا تو مجھے انگریزی آگئی ہے، یا سب کو بھول گئی ہے۔کچھ بھی ہو، میری خوشی کی انتہا نہیں، اب سارے سپیلنگ بدل گئے ہیں اور دو تین لفظوں میں سما گئے ہیں۔ اب Coming لکھنا ہو تو صرف cmg سے کام چل جاتا ہے۔گرل فرینڈ GF ہوگئی ہے اور فیس بک FB بن گئی ہے۔ اب کوئی انگریزی کا لمبا لفظ لکھنا ہو تو اُس سے پہلے کے چند الفاظ لکھ کر ہی ساری بات کہی جاسکتی ہے، میں نے ساڑھے تین سال کی''ٹیوشن بامشقت'' کے بعد unfortunately کے سپیلنگ یاد کیے تھے، آج کل صرف Unfort سے کام چل جاتاہے یعنی جہاں سے مشکل سپیلنگ شروع وہیں پہ ختم۔

بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اب تو اس مختصر انگریزی میں بھی ایسی ایسی مشکلات آن پڑی ہیں کہ کئی دفعہ جملہ سمجھنے کے لیے استخارہ کرنا پڑتاہے۔ ابھی کل مجھے ایک دوست کامیسج آیا، لکھا تھا''U r inv in bk crmy'' میں نے حیرت سے میسج کو پڑھا، اللہ جانتا ہے تین چار دفعہ مجھے شک گذرا کہ اُس نے مجھے کوئی گندی سی گالی لکھی ہے، دل مطمئن نہ ہوا تو ایسی ہی انگلش لکھنے اور سمجھنے کے ماہر ایک اور دوست سے رابطہ کیا، اُس مردِ مجاہد نے ایک سیکنڈ میں ٹرانسلیشن کردی کہ لکھا ہے You are invited in book's ceremony۔۔۔!!!

انگریزی سے نمٹنے کا ایک اوراچھا طریقہ میرے ہمسائے شاکر صاحب نے نکالا ہے، جہاں جہاں انہیں انگریزی نہیں آتی وہاں وہ اطمینان سے اُردو ڈال لیتے ہیں۔مثلًا اگر کھانا کھاتے ہوئے اُنہیں کسی کا میسج آجائے تو جواب میں لکھ بھیجتے ہیں''پلیز اِس ٹائم ناٹ ڈسٹرب، آئی ایم کھانا کھائینگ''۔ ایک دفعہ موصوف کو فیس بک پر ایک لڑکی پسند آگئی، فوراً لکھا''آئی وانٹ ٹو شادی وِد یو۔۔۔آر یو راضی؟''۔ لڑکی کا جواب آیا''ہاں آئی ایم راضی، بٹ پہلے ٹرائی ٹو راضی میرا پیو تے بے بے ''۔آج کل یہ دونوں میاں بیوی ہیں اوراکثر اسی انگریزی میں لڑائی جھگڑا کرتے ہیں، تاہم اب وہ درمیان میں اُردو کی بجائے پنجابی بولتے ہیں اور ایک جملہ بار باردہراتے ہیں'' آئی سیڈ کھصماں نوں کھا ، یور سارا خاندان اِز چول''۔

انگریزی کے بدلتے ہوئے رنگ صرف یہیں تک محدود نہیں، اب تو کوئی صحیح انگلش میں جملہ لکھ جائے تو اُس کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگتا ہے، ماڈرن ہونے کے لیے انگریزی کا بیڑا غرق کرنا بہت ضروری ہوگیاہے ،میں تو کہتا ہوں انگریزی کی صرف ٹانگ ہی نہیں، دانت بھی توڑ دینے چاہئیں ، اِس بدبخت نے ساری زندگی ہمیں خون کے آنسو رُلایا ہے۔تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اب انگریزی لکھنے کے لیے گرائمراورTenses بھی غیر ضروری ہوگئے ہیں۔یعنی اگر کسی کو کہنا ہو کہ ''میں تمہارا منتظر ہوں، تم کب تک آؤ گے؟'' تو بڑی آسانی سے اِسے چٹکیوں میں یوں لکھا جاسکتا ہے m wtg ?u cm whn۔۔۔!!!

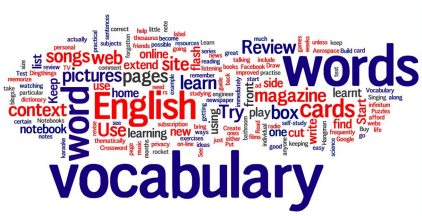


دنیا مختصر سے مختصر ہوتی جارہی ہے، کمپیوٹر ڈیسک ٹاپ سے لیپ ٹاپ اور اب آئی پیڈ میں سما چکے ہیں، موٹے موٹے ٹی وی اب سمارٹ ایل سی ڈی کی شکل میں آگئے ہیں، ونڈو اے سی کی جگہ سپلٹ اے سی نے لے لی ہے،انٹرنیٹ ایک چھوٹی سی USB میں سمٹ چکا ہے .ایسے میں انگریزی کو سب کے لیے قابل قبول بنانے کی اشد ضرورت محسوس ہورہی تھی، اُردو کا حل تو ''رومن اُردو'' کی شکل میں بہت پہلے نکل آیا تھا، اب انگریزی کی مشکل بھی حل ہوگئی ہے۔

اب جو جتنی غلط انگریزی لکھتاہے اُتنا ہی عالم فاضل خیال کیا جاتا ہے، اگر آپ کو کسی دوست کی طرف سے میسج آئے اور اُس میں That کی بجائے Dat لکھا ہو توبیہودہ سا قہقہہ لگانے کی بجائے ایک لمحے میں سمجھ جائیں کہ آپ کا دوست ایک ذہین اور دنیا دار شخص ہے جو جدید انگریزی کے تمام تر لوازمات سے واقف ہے۔میں سمجھتا تھا کہ شاید انگریزی میں اُردو اور پنجابی کا تڑکا ہمارے ہاں ہی لگایا جاتا ہے لیکن میر اخیال غلط ثابت ہوا، سعودیہ میں مقیم میرا بھانجا بتا رہا تھا کہ یہاں کے عربی بھی انگریزی کا شوق پورا کر رہے ہوں تو جہاں جہاں انگریزی آنکھیں دکھاتی ہے وہاں یہ عربی کا لفظ ڈال لیتے ہیں، مثلًااگر انگریزی میں کہنا ہو کہ یہ میرا گھر ہے تو بڑے آرام سے کہہ جاتے ہیں ''ھذا مائی ہوم''۔

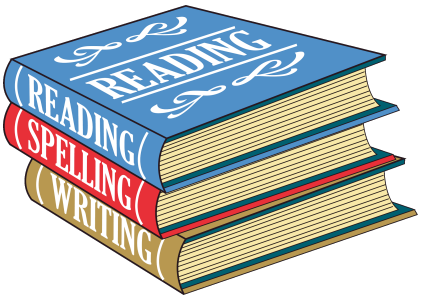


انگریزی اتنی آسان ہوگئی ہے لیکن بڑے دکھ کے ساتھ بتانا پڑ رہا ہے کہ یہ آسان انگریزی صرف ہماری عام زندگیوں میں ہی قابل قبول ہے، انگریزی کا مضمون پاس کرنے کے لیے تاحال اُسی جناتی انگریزی کی ضرورت ہے جوخود انگریزوں کو بھی نہیں آتی۔

§§§

# بے چین

مصنف: یوسف اقبال

میکوٹن نے سامنے بیٹھے امیدوار کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ دبلا پتلا گندمی رنگت کا آدمی کام کی تلاش میں آیا تھا۔ میکوٹن نے اُسے بتایا کہ یہ کام بہت مشقت والا اور عارضی ہے تمھیں نقد ادائیگی کی جائے گی۔ یہ پرانی عمارتیں گرانے کا کام ہے جس میں خطرہ بھی ہے لیکن بیمہ یا صحت کے علاج کے سلسلے میں ہماری کوئی ذمے داری نہیں ہوگی۔

رام لعل نے اقرار میں سر ہلا دیا ۔ اس کا تعلق بھارتی علاقے راجستھان کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔وہ طب کی تعلیم پانے آئرلینڈ آیا تھا۔ اس کا آخری سال تھا، اپنی ضروریات پورا کرنے کی خاطر اُسے مزید آمدن درکار تھی۔ اسی لیے وہ ٹھیکیدار کے دفتر عارضی ملازمت حاصل کرنے آیا تاکہ موسم گرما کی چھٹیوں میں کچھ آمدن حاصل کر سکے۔میکوٹن نے رام لعل سے کہا، وہ کل سے کام پر جائے۔ اوقات صبح ۷ بجے سے شام کے ۷ بجے ہیں۔ تمام مزدوروں کو ٹرک صبح ۶ بجے اسٹیشن کے سامنے سے لیتا ہے۔

ان کا انچارج بل کیمرون ہے، میں اسے بتا دوں گا۔رام لعل دفتر سے باہر آیا اور ایک کمرا تلاش کرنے لگا۔ کوشش کے بعد اسے اسٹیشن کے قریب ایک کمرا مل گیا۔ اتوار کے روز وہ اپنے مختصر سامان کے ساتھ اس کمرے میں منتقل ہوگیا۔دوپہر کے وقت وہ بستر پر لیٹا اپنے گاؤں کی پہاڑیوں، کھیتوں اور کسانوں کو یاد کرتا اور سوچتا رہا تھا کہ جلد اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر بن کر گاؤں چلا جائے گا۔پیر کی صبح رام لعل جلدی اٹھا اور ۶ بجے کے قریب مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد ٹرک پہنچ گیا۔ اس وقت تک ۱۲ افراد جمع ہو چکے تھے۔ رام لعل کچھ دور ہٹ کر انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں گروپ انچارج بھی پہنچ گیا ۔ اس کے پاس مزدوروں کی فہرست تھی اور وہ سب کو جانتا تھا۔ رام لعل اُس کے قریب پہنچاتو فورمین نے پوچھا ''کیا تم وہی کالے آدمی ہوجسے میکوٹن نے ملازم رکھا ہے۔''اس نے کہا ''ہاں میں ہی ہری کشن رام لعل ہوں۔''فورمین بل کیمرون کا رویہ اس کی شخصیت کا آئینہ دار تھا۔ اس کا قد ۶ فٹ ۱۳ نچ اور جسم طاقتور تھا، شکل سے بھی وہ ایک پہلوان معلوم ہوتا ۔ غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اس نے حقارت سے زمین پر تھوکا اور رام لعل سے کہا ''جائو ٹرک میں بیٹھو''۔ دورانِ سفر ایک شخص نے پوچھا ''تم کہاں سے آئے ہو۔'' اس نے کہا ''بھارت کے علاقے راجستھان سے۔ ''آدمی نے پوچھا ''کیا تم عیسائی ہو؟''رام لعل نے کہا ''میں ہندو ہوں۔''

اس شخص نے پھر جس کا نام برنس تھا، باقی لوگوں سے رام لعل کا تعارف کرایا۔ ایک شخص نے کہا ''تمھارے پاس کھانا نہیں ہے؟''رام لعل نے کہا''میں کل سے لاؤں گا۔'' دوسرے شخص نے پوچھا ''کیا تم نے ایسا مشقتی کام پہلے کیاہے؟''رام نے نفی میں سر ہلادیا۔ اس شخص نے کہا'' تمھیں مضبوط جوتے اور دستانے بھی خریدنے ہوں گے''۔ باتوں باتوں میں رام لعل نے بتایا کہ وہ طب کا طالب علم ہے اور اسے مجبوراً یہ کام کرناپڑرہاہے تاکہ کچھ زائد آمدن حاصل کرسکے۔ٹرک ڈوپلڈ روڈ پر ایک کچے راستے پر درختوں کے قریب رک گیا۔ وہاں کومبر کے کنارے شراب کی ایک پرانی فیکٹری تھی جسے گرایاجاناتھا۔

عمارت کے مالک کی خواہش تھی کہ کم سے کم رقم خرچ ہو۔ لہٰذا اس نے کسی بڑی کمپنی کے بجائے ٹھیکیدار میکوٹن سے بات کی جومناسب رقم میں بغیر مشینری کے عمارت گرانے کے لیے تیار ہوگیا۔ میکوٹن کے مزدوروں نے یہ کام بھاری ہتھوڑوں اور کدالوں کی مدد سے کرنا تھا۔ میکوٹن کو یہ بھی لالچ تھا کہ عمارت ٹوٹنے سے نکلنے والی لکڑی اور سیکڑوں ٹن اینٹیں فروخت کرکے اضافی آمدنی حاصل ہوگی۔مزدور اوزار اٹھائے عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے پاس بڑے ہتھوڑے، لمبی چھینیاں اور رسے تھے۔

فورمین نے کہا ''چلو بھئی کام شروع کرو۔ ہم سب سے پہلے چھت کی ٹائلیں توڑیں گے۔'' رام لعل نے اندر چھت دیکھی جو کسی چار منزلہ عمارت کے برابر اونچی تھی۔ اسے اونچائی سے خوف آتا تھا۔ ایک آدمی نے پرانی لکڑی کا دروازہ توڑا اور آگ جلا کر چائے کا پانی رکھا۔ سب لوگوں نے تام چینی کے مگ نکالے اور چائے پینے لگے۔ رام لعل نے سوچا کہ کل وہ مگ بھی خرید لے گا۔ تاہم برنس نے اپنے مگ میں رام لعل کو چائے دی۔ چھت پر کام شروع ہوگیا۔ ٹائلیں اکھاڑ کے نیچے پھینکی جانے لگیں۔ ۱۲ بجے کے بعد کھانے کا وقفہ ہوا اور سب لوگ نیچے آگئے۔ چائے بنی اوررام لعل کے سوا سب مزدورں نے کھاناکھایا۔ اس نے اپنے ہاتھ دیکھے جو جگہ جگہ سے چھل گئے تھے اور سارا جسم دکھ رہا تھا۔

برنس نے رام لعل سے کہا'' لو تم بھی سینڈوچ کھا لو، میرے پاس کافی ہیں''۔ بل کیمرون سامنے بیٹھا تھا ،اس نے برنس سے کہا'' تم کیا کررہے ہو۔ کالے کو اپنا کھانا خود لانے دو، تم صرف اپنی فکر رکھو''۔ برنس نے اپنی نظریں جھکالیں کیونکہ کوئی بھی فورمین کے آگے نہیں بول سکتا تھا۔پورے ہفتے کام چلتا رہا۔ عمارت کی چھت، دیواریں، دروازے اور کھڑکیاں نیچے ملبے کے ڈھیر پر گرتی رہیں۔ رام لعل کے لیے یہ سخت محنت کا کام تھا، ہاتھ زخمی ہوگئے لیکن رقم کی خاطر وہ محنت کرتا رہا۔ اس دوران فورمین بل کیمرون جسے لوگ ''بگ بلی'' بھی کہتے تھے، رام لعل کے پیچھے لگا رہا۔ مشکل سے مشکل کام اسے دیا جاتا اور وہ بے عزتی کرنے کا بھی کوئی موقع ضائع نہ کرتا۔

ہفتے کے روز تک اندر کا کام پورا ہوچکا ۔ اب باہر کی دیواریں باقی تھیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دیواروں میں نیچے ڈائنامائٹ لگایا جاتا تو ایک ساتھ پورا ملبہ نیچے آ گرتا۔ لیکن میکوٹن کے لیے یہ طریقہ ناقابلِ عمل تھا۔ اس کے لیے لائسنس کی ضرورت تھی جو شمالی آئرلینڈ میں مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ محکمہ ٹیکس اور انشورنس والوں کو بھی ادائیگی کرنا پڑتی۔ لہٰذا یہ سارا کام مزدوروں کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔ خودکو خطرہ میں ڈالتے دیواریں ہتھوڑوں سے توڑ رہے تھے۔کھانے کے وقت فورمین نے ادھر اُدھر گھوم کر کام کا جائزہ لیا اور پھر کہا کہ اس طرف کی دیوارکا بڑا حصہ پہلے توڑنا ہے۔ پھروہ رام لعل کی طرف مڑا اور کہا '' میں چاہتا ہوں کہ تم اوپر چڑھو اور جب دیوار گرنے لگے تو اسے باہر کی طرف دھکا دو''۔

بل کیمرون جانتا تھا کہ رام لعل اونچائی سے ڈرتا ہے۔رام لعل نے جواب دیا '' اس پوری دیوار میں دراڑ پڑی ہوئی ہے۔ جو بھی اوپر گیا، وہ اس کے ساتھ ہی گرے گا۔'' بل کیمرون کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا ، وہ چیخ کر بولا ''تم مجھے میرا کام مت سمجھائو ۔ کالے آدمی،جیسا تم سے کہا،وہی کرو''۔رام لعل اٹھااور فورمین کے سامنے جا کربولا۔'' مسٹر کیمرون! ایک بات صاف ہونی چاہیے۔ میرا تعلق راجپوت قبائل سے ہے۔ گو اس وقت میرے پاس تعلیمی اخراجات کے لیے رقم کم ہے لیکن میرے آبا ء واجداد میں دو ہزار سال قبل راجہ، مہاراجہ ، شہزادے اور فوج کے سپہ سالار گزرے ہیں۔

اس وقت تم لوگ بندروں کی طرح چاروں ہاتھ پیر پر چلتے اور کپڑوں کی جگہ کھال پہنتے تھے ۔ براہِ مہربانی آپ میری بے عزتی کرنا بند کردیں۔ ہر انسان کی اپنی عزت ہوتی ہے جس کی حفاظت اس کا فرض ہے''۔رام لعل کی یہ مختصر تقریر سب لوگوں نے دم بخود سنی۔ بل کیمرون کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے چیخ کر گالی دی اور کہا ''اچھا تو تم واقعی عزت دار تھے''۔ ساتھ ہی اس نے رام لعل کے منہ پر الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ رسید کیا۔ بیچارا رام لعل زمین سے اُڑ کر کئی فٹ دور جا گرا۔ برنس کی آواز آئی ''لڑکے زمین سے اٹھنا مت، ورنہ بگ بلی تمھیں جان سے ہی مار دے گا۔'' رام لعل نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دیوزاد بل کیمرون مٹھیاں بند کئے اس کے اٹھنے کا منتظر تھا۔

رام لعل کا اس سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خاموشی سے پڑا رہا۔ دُکھ اور بے عزتی کی تکلیف سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔بند آنکھوں سے رام نے خود کو وطن میں پایا جہاں اس کے آباء واجداد گھوڑوں پر سوار، تلواروں اور نیزوں سے لیس آس پاس سے گزرتے اسے صرف ایک لفظ کہہ رہے تھے'' انتقام، انتقام۔ تمھیں اپنی بے عزتی کا انتقام لینا ہوگا۔'' رام لعل خاموشی سے اٹھا اور کام میں لگ گیا۔ سارا دن نہ وہ کسی سے بولا اور نہ کوئی بات کی۔اس رات

جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو باہر گرج چمک ہو رہی تھی اور طوفانی بارش کے آثار تھے۔ وہ بسترپرلیٹ گیا اورکوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا جس سے انتقام لے سکے۔تھوڑی دیربعد بارش شروع ہونے لگی۔اس کی نظرکھڑکی کے شیشے پرپڑی جہاں بارش کی بوندیں ایک قطار کی شکل میں بہنے لگی تھیں۔ شیشے پر پڑی مٹی کی وجہ سے پانی کی قطار سیدھی کے بجائے لہراتی ہوئی بہنے لگی۔ اچانک رام لعل کی نظر کونے پر پڑی ڈریسنگ گائون کی ڈوری پہ گئی جو ہوا سے نیچے گر گئی تھی۔ گری ڈوری ایسی لگتی تھی کہ پتلا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ رام لعل سمجھ گیا کہ اسے کیاتدبیراختیارکرنی چاہیے۔اگلے روز رام لعل بذریعہ ریل بیلفاسٹ گیا اور اپنے سکھ دوست سے ملا۔ رنجیت سنگھ بھی اس کی طرح طالب علم تھا لیکن اس کے والدین دولت مند تھے اور اسے ماہانہ اچھی رقم اخراجات کے لیے بھیجتے ۔ رام لعل نے اس سے کہا کہ مجھے گھر سے اطلاع ملی ہے، میرے والد بستر مرگ پر ہیں۔ میں سب سے بڑا بیٹا ہوں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مجھے واپس ہندوستان جانا ہوگا۔ رنجیت سنگھ نے کہا کہ ہاں یہی روایت ہے کہ والد کے انتقال کے وقت بڑا بیٹا اس کے پاس ہو۔ رام لعل نے کہا ،میرا مسئلہ ہوائی سفر کے ٹکٹ کا ہے۔ میں کام بھی کررہا ہوں لیکن میرے پاس کافی پیسے نہیں ۔ کیا تم مجھے کچھ رقم ادھار دے دو گے؟ میں زائد کام کرکے تمھاری رقم لوٹا دوں گا۔ سکھ نے کہا کہ کوئی بات نہیں، میں کل بینک سے رقم نکلوا کر تمھیں دے دوں گا۔اس روز شام کو رام لعل اپنے ٹھیکیدار مسٹر میکوٹن سے ملا اور اپنے والد کے بارے میں بتایا کہ اس کا آخری وقت قریب ہے۔

میں اس سے ملنے جا نا چاہتا ہوں۔ یہ ہمارا مذہبی طریقہ ہے کہ مرنے والے کی آخری رسوم اس کا بڑا بیٹا ادا کرے۔ رام لعل نے یہ بھی کہا '' میں نے ہوائی کرائے کی رقم دوست سے اُدھار لی ہے۔ اگر میں کل کی پرواز سے روانہ ہوجائوں تو اگلے ہفتے واپس آ سکتا ہوں۔''ٹھیکیدار نرم دل آدمی تھا، اس نے کہا ''ٹھیک ہے !تم جاسکتے ہو۔ اگر تم وعدے کے مطابق واپس پہنچ جاتے ہوتو انہی شرائط پر دوبارہ کام شروع کردینا''۔رام لعل نے شکریہ ادا کیا اور واپس آگیا۔ اگلے روز اس نے اپنے سکھ دوست سے رقم ادھار لی اور بذریعہ ریل لندن پہنچ کر بھارت جانے کے لیے ٹکٹ خرید لیا ۔ اس طرح ۲۴ گھنٹوں کے اندر وہ بمبئی پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ ایک دکان پر پہنچا جہاں پالتو پرندے، سانپ اور دیگر جانور فروخت ہوتے تھے۔ اُسے دراصل ایک چھوٹے زہریلے سانپ کی تلاش تھی۔

دکاندار نے بتایا کہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ کل ہی میرے پاس ایک چھوٹا سانپ آیا ہے جو آراکھیراناگ (Saw Scaled Viper )کہلاتا ہے۔ یہ سانپ مغربی افریقہ سے عرب، ایران، پاکستان اور بھارت کے خشک اور نم علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۰۔۱۵ سینٹی میٹر تک، رنگ گہرا بھورا اور جسم پتلا ہوتا ہے۔ زہریلے دانت شکار کی جلد پر سوئی جیسے دو سوراخ چھوڑتے ہیں۔ زہر اتنا تیز اثر ہوتا ہے کہ دو تین گھنٹوں میں موت واقع ہوجاتی ہے۔ موت کا سبب دماغ میں خون کا اخراج ہوتا ہے۔رام لعل نے دکان کے مالک سے پوچھا کہ اس سانپ کی کیا قیمت لوگے؟ کچھ دیر بحث کے بعد سودا ۳۵۰ روپے میں طے ہوگیا۔ رام لعل سانپ کو ایک ڈھکن والی بوتل میں بند کرکے گھرچلاآیا۔ لندن سفر کے لیے رام لعل نے ایک سگار بکس خریدا۔ اسے خالی کرکے اس میں پندرہ چھوٹے سوراخ کیے اور سانپ نرم پتوں کے ساتھ سگار بکس میں بند کرکے اسے اچھی طرح ٹیپ سے بند کردیا۔ اس طرح لندن واپسی کا سفر شروع ہوا۔ شام تک رام لعل اپنے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔

اس نے سگار بکس نکال کر دیکھا۔ سانپ بالکل صحیح حالت میں سیاہ چمک دار آنکھوں سے رام لعل کو گھور رہا تھا۔رام لعل نے شیشے کا ایک ڈھکن دار مرتبان خالی کیا تاکہ صبح استعمال کیا جائے۔ صبح جلدی اٹھ کر اس نے انتہائی احتیاط سے سانپ کو سگاربکس سے مرتبان میں منتقل کیا۔ مضبوطی سے ڈھکن لگایا اور اسے اپنے لنچ بکس میں حفاظت سے رکھ دیا۔مقررہ وقت وہ اسٹیشن پہنچاجہاں سے ٹرک سب مزدوروں کو لیے کام کی جگہ جاتا تھا۔بل کیمرون کی یہ عادت تھی کہ کام شروع کرنے سے پہلے وہ اپنی جیکٹ اتار کر کسی شاخ پہ اُتار دیتا تھا۔ کھانے کے وقفے میں وہ جیکٹ کی جیب سے اپنا پائپ اور تمباکو کی تھیلی نکال کر پائپ ضرور پیتا ۔رام لعل کا ارادہ تھا کہ وہ موقع پاکر سانپ کو بل کیمرون کی جیکٹ کی جیب میں چھوڑ دے گا۔ پھروہ جیکٹ کی جیب سے پائپ اور تمباکو نکالے گا۔ اس دوران سانپ بل کیمرون کو ڈس لے گا۔ بل کیمرون گھبرا کر ہاتھ جیب سے نکالے گا، تو سانپ اس کے ہاتھ سے لٹکا ہوگا کیونکہ اس کے دانت گوشت میں گڑے ہوں گے۔ منصوبے کے مطابق رام لعل کسی بہانے ۱۱ بجے کے قریب اٹھا۔

اپنا لنچ بکس کھول کر سانپ کا مرتبان نکالا ، ڈھکن کھول کر بل کیمرون کی جیکٹ کی داہنی جیب میں الٹا اور فوراً واپس آکر کام میں لگ گیا۔ کھانے کے دوران سب لوگ دائرے میں بیٹھ کر سینڈوچ کھانے لگے۔ رام لعل کا دل کھانے میں نہیں لگ رہا تھا، وہ زبردستی سب کے ساتھ بیٹھا ۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر فورمین کی جیکٹ کی طرف دیکھتا ۔ آخرکار بل کیمرون نے کھانا ختم کیا ، اُٹھ کر اپنی جیکٹ کی طرف گیا اور داہنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔چند سیکنڈ بعد اس نے پائپ اور تمباکو کی تھیلی نکالی ، پائپ بھر کر جلایا اور پینا شروع کردیا۔رام لعل مایوسی اور نااُمیدی کا شکار تھا کہ اس کی چال نے اپنا کام نہیں دکھایا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بے یقینی سے جیکٹ کی طرف دیکھا۔ اسے چند سیکنڈ کے لیے جیکٹ کے ایک کنارے پر کوئی چیز چلتی نظر آئی۔ جیکٹ کی جیب میں پائے جانے والے چھوٹے سے سوراخ سے سانپ نکل کر اندرونی سلائی میں چھپ گیاتھا۔شام کو واپسی کے وقت فورمین نے اپنی جیکٹ اتار کر اپنے برابر رکھ لی اور مقررہ مقام پر سب لوگ اتر کر اپنے گھر جانے لگے۔

رام لعل نے برنس سے پوچھا کہ کیا بل کیمرون کے بیوی بچے ہیں؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔رام لعل اپنے کمرے پہنچا اور دل سے دعا کرنے لگا کہ میں اپنی بے عزتی کا بدلہ بل کیمرون سے لینا چاہتا تھا لیکن اس کے بیوی بچوں کو نقصان پہنچانا میرا مقصد ہر گز نہیں ۔ اتوار کا دن بھی انہی سوچوں میں گزر گیا۔پیر کی صبح بل کیمرون اور اس کے بیوی بچے صبح ۶ بجے کے قریب اٹھے اور ناشتاکرنے باورچی خانے میں جمع ہوگئے۔ بل کیمرون کام پہ جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس نے بیٹی سے کہا کہ ذرا میری جیکٹ تو لانا۔ وہ الماری سے نکال کر لائی۔ بل نے کہا: ''اسے دروازے کے پیچھے ٹانگ دو۔میں ابھی لیتا ہوں۔'' جب بیٹی نے جیکٹ ٹانگی تو وہ پھسل کر باورچی خانے کے فرش پر گر پڑی۔ بلی نے غصے سے کہا ''تم سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ جیکٹ اٹھا کر اچھی طرح ٹانگو۔''''بابا، یہ آپ کی جیکٹ سے کیا چیز گری ۔

'' بگ بلی کی بیوی، بیٹے اور سب نے اس طرف دیکھا۔ ایک چھوٹا سا جاندار فرش پر پڑا چمکیلی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ باریک دو شاخہ زبان لہراتی نظر آرہی تھی۔

بل کی بیوی بولی'' خدا ہمیں محفوظ رکھے ،یہ تو کوئی سانپ ہے''۔بل کیمرون غصے سے بولا: ''پاگل نہ بنو، کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آئرلینڈ میں قدرتی طور پر کوئی سانپ نہیں پایا جاتا۔ ہر شخص یہ بات جانتا ہے۔ '' پھر اُس نے بیٹے سے پوچھا: ''بوبی، تم تو اسکول میں سائنس پڑھتے ہو، تمھارے خیال میں یہ کیا چیز ہے۔'' لڑکے نے سانپ کی طرف غور سے دیکھا اور کہا: ''یہ یقینا کیچوا ہے جو عموماً جنگل کی گھاس میں پایا جاتاہے۔'' بگ بلی نے اپنے بیٹے سے کہا: ''یہ جو کچھ بھی ہے، اسے مار کر باہر پھینک دو۔'' بوبی اٹھا اور اپنا جوتا نکال کراس جانور کو مارنے چلا۔ بل کیمرون کے دماغ میں ایک اور خیال آیا۔ اس نے کہا: ''ذرا رک جائو اور مجھے ایک ڈھکن والا مرتبان دو۔''مرتبان آیا تو بلی اٹھا اور بہت احتیاط اور پھرتی سے سانپ کو مرتبان میں منتقل کردیا۔

سانپ بھی آئرلینڈ کے سرد موسم سے کچھ سست ہوگیا تھا۔ بلی کے بیٹے نے پوچھا: ''ابوآپ اس کا کیا کریں گے؟''بلی نے کہا: ''ہمارے گروہ میں ایک کالا بھارت سے آیا ہے، وہاں بہت سانپ ہوتے ہیں۔ میں نذرا اس کے ساتھ مذاق کروں گا۔وہ تو شاید خوف کے مارے مر ہی جائے گا۔''اس نے جیکٹ پہنی، کھانا لیا اور بیگ میں پھر سانپ والے مرتبان کے ساتھ رکھ دیا۔پھروہ اسٹیشن روانہ ہوگیا۔ وہاں سب لوگ مع رام لعل موجود تھے۔ ٹرک میں سوار ہوکر یہ پارٹی کام والی جگہ پرروانہ ہوگئی۔

وہاں کام شروع ہونے سے پہلے چائے کے دوران بل کیمرون نے چپکے چپکے دیگر لوگوں کو بھی بتا دیا کہ وہ اس کالے کے ساتھ کیا مذاق کرنے والا ہے۔اس کے ساتھیوں نے سوچا کہ یہ ایک بے ضرر کیڑا ہے ، رام لعل کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لہٰذا ایسے مذاق میں کوئی حرج نہیں ۔کھانے کے وقفے میں سب لوگ حسبِ معمول دائرے کی شکل میں بیٹھے ۔ رام لعل نے کچھ خیال نہ کیا لیکن باقی لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اس نے اپنا لنچ باکس گھٹنوں پر رکھا اور اسے کھولا۔ سینڈوچ اور سیب کے بیچ چھوٹاسانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ رام لعل کی زبردست چیخ سے علاقہ گونج اٹھا اور ساتھ ہی سب مزدورے ساختہ زور دار قہقہے لگانے لگے۔ رام لعل نے گھبرا کر اپنا لنچ باکس زور سے ہوا میں اچھال دیا۔ سانپ اور سینڈوچز تمام چیزیں چاروں طرف گھاس میں گر پڑیں۔ رام لعل چیختے ہوئے کھڑا ہوگیا اوربولا'' یہ سانپ بہت زہریلا اور خطرناک ہے۔ ''سب لوگ پھر سے ہنسنے لگے۔ رام لعل نے ان سے کہا: '' یقین کرو، یہ انتہائی زہریلا سانپ ہے۔''بل کیمرون کی آنکھوں میں ہنستے ہنستے آنسو آگئے۔

وہ رام لعل سے کہنے لگا: ''کالے آدمی، تم تو بہت ہی بے وقوف ہو۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ آئرلینڈ میں کوئی سانپ نہیں پایا جاتا۔''بگ بلی ہنستے ہنستے کچھ تھک گیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ گھاس پر لیٹ گیا کہ چند منٹ آرام کرلے۔تب اسے معمولی چبھن کا بھی احساس نہیں ہوا۔ اس کی داہنی کلائی پر سوئی کی نوک کے برابر دو انتہائی باریک سوراخ ہو چکے تھے۔ کھانا ختم ہوچکا تھا۔ سب لوگ کام کے لیے اٹھ گئے۔ عمارت توڑنے کا کام تقریباً ختم ہوچکا تھا۔ سارا ملبہ ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا۔ دو گھنٹے بعد بل کیمرون نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا، اسے کچھ پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے کچھ خیال نہ کیا۔تھوڑی دیر بعد اس نے ہتھوڑا ہاتھ سے رکھا اور اپنے ساتھی سے کہا '' میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ میں ذرا دیر سایہ میں آرام کر لیتا ہوں۔'' پھر وہ درخت کے نیچے بیٹھا سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے سر میں شدید درد ہورہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کے پورے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ پیچھے کی طرف الٹ کر گرا۔

سب سے پہلے برنس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پیٹرسن کو آواز دی اورکہا: ''بگ بلی بہت بیمار لگ رہا ہے۔ میری بات کا اُس نے جواب بھی نہیں دیا۔'' سب مزدوروں نے کام چھوڑ دیا اور اس درخت کے پاس آگئے جہاں بل کیمرون زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن اُن میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ پیٹرسن نے رام لعل کو آواز دی کہ ادھر آئو اور اسے دیکھو۔ تم طب کے طالب علم ہو، تمھارا کیا خیال ہے؟ رام لعل کو کسی معاینے کی ضرورت تو نہ تھی لیکن پھر بھی اس نے جھک کر نبض دیکھی اور پیٹرسن سے کہا کہ یہ تو مر چکا۔پیٹرسن نے کہا '' سب لوگ یہیں ٹھہریں۔ میں ایمبولینس بلاتااور ٹھیکیدار میکوٹن کو بھی مطلع کرتا ہوں۔''

وہ پھر پیدل سڑک کی طرف روانہ ہوا تاکہ بوتھ سے فون کرسکے۔ ایمبولینس کے پہنچنے پر بل کیمرون کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔وہاں ڈاکٹروں نے معاینہ کیا اور بتایا کہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس شخص کی موت واقع ہوچکی ۔ میکوٹن بھی پریشانی کے عالم میں ہسپتال پہنچ گیا۔پولیس اور عدالتی کارروائی میں چند روز لگے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق بل کیمرون کی موت قدرتی طور پر ہوئی۔ وجہ دماغ میں شدید اخراجِ خون تھا۔ عیسائی مذہب کے طریقے کے مطابق تدفین ہوئی جس میں اس کے خاندان، میکوٹن اور دیگر ساتھی بھی شریک ہوئے۔رام لعل نے تدفین میں شرکت نہیں کی بلکہ وہ اس مقام پر جا پہنچا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ گھاس میں کھڑے ہوکر دل ہی دل میں کچھ کہنے لگا ''اے زہریلے سانپ !کیا تم میری بات سن سکتے ہو۔ تم نے وہ کام کردکھایا جس کے لیے تمھیں راجستھان کی پہاڑیوں سے یہاں لایا گیا تھا۔ میرا انتقام پورا ہوگیا۔ میرے منصوبے کے مطابق تمھیں کام کرنے کے بعد مر جانا تھا۔ کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ ابھی نہیں تو کچھ عرصے بعد تم مر جائو گے۔ بغیر مادہ کے تمھاری نسل آگے نہیں چل سکتی کیونکہ آئرلینڈ میں کوئی سانپ نہیں پائے جاتے۔

§§§

# پرلطف ترین شخص

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

چارلی چپلن ایک لیجنڈ آرٹسٹ تھا اس نے بہت کم عرصے میں اپنی سوچ اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر بہت کچھ پروڈیوس کرنے کے بعد دکھا دیا کہ دنیا میں ہر طرح کے انسان بستے ہیں اس کی کامیڈی فلمیں صرف انٹرٹینمنٹ ہی نہیں بلکہ سبق آموز بھی تھیں اسکی نقالی آج بھی دنیا بھر میں کی جاتی ہے۔ تھیٹر ، سٹیج شوز ،سنیما اور ٹیلی ویژن نے نیا ٹرینڈ لا کر دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے لیکن ساتھ ساتھ آج بھی کئی لوگ ان چیزوں سے شدید نفرت کرتے اور آرٹسٹوں کو میراثی اور کنجر وغیرہ کہتے ہیں حالانکہ آرٹسٹ وہ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں انسان ہونے کے ساتھ اپنے اندر جذبات اور احساسات کا سمندر رکھتے ہیں اور آرٹسٹ سے نفرت کرنا انسانیت سے نفرت کرنے کے مترادف ہے۔کئی برسوں تک سنیما میں اگرچہ ہر دور میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ نیا دکھایا جاتا اور شائقین محفوظ ہوتے لیکن ٹی وی آنے کے بعد انسانوں کی سوچ یکسر بدل گئی کیونکہ چھوٹی سکرین پر ایڈورٹائزنگ کی بدولت دنیا کی ہر اچھی اور بری شے نشر کی جانے لگی ایک طرف اگر معلومات کا خزانہ ہوتیں تو دوسری طرف کئی انسانوں کے لئے منفی بھی ثابت ہوتیں ، ساٹھ اور ستر کی دہائی میں ٹی وی پر ہر نئی شے کو دیکھ کر ہر ایک کی زبان پر یہ ہوتا کہ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے ،سائنس کتنی ترقی کر گئی ہے وغیرہ ۔مستقبل قریب یعنی دوہزار پچیس تک سائنسی دنیا میں نیا انقلاب آجائے گا آنے والے سات آٹھ برسوں کے اندر ہم کئی پرانی اشیاء سے محروم ہو جائیں گے اور یہ اشیاء ماضی کا حصہ کہلاتے ہوئے اینٹک شمار کی جائیں گی جیسے کہ آج کل ٹرانزسٹر یا ٹیپ ریکارڈر وغیرہ کا کہیں نام و نشان نہیں ہے آج کی جنریشن نہیں جانتی کہ کیسٹ ریکارڈر کیا ہوتا ہے۔ہائی ٹیک یعنی ہائی ٹیکنالوجی دنیا بھر میں سپیڈ پکڑ چکی ہے اور ہر انسان کی ضرورت بھی بن گئی ہے کیونکہ جتنی تیزی سے سائنس ترقی کر رہی ہے انسان کیلئے سہولت پیدا ہو رہی ہے اتنی تیز رفتاری سے انسان سست اور نکما ہوتا جا رہا ہے ۔لیکویڈ کرسٹل ڈسپلے جنہیں ایل سی ڈی ٹیلی ویژن کہا جاتا ہے حیرت انگیز طور پر اپنی مخصوص بناوٹ سے دنیا بھر میں مقام حاصل کر چکے ہیں اور موٹی توند والے ٹی وی کو کچرے کے ڈبے یعنی ری سائیکلنگ کمپنیز کو واپس کر دیا گیا ہے آج ماضی کا حصہ بن چکے ہیں کیونکہ ایل سی ڈی ٹی وی بہت پتلے یعنی سمارٹ ہونے کے ساتھ بہت کم جگہ لیتے اور آج کل بہت ارزاں قیمت پر دستیاب ہیں اسکے باوجود گزشتہ برس ایل جی کمپنی نے مستقبل کیلئے ایک نیا ٹی وی متعارف کروایا ہے جسے اورگانِک لائٹ ایمٹنگ ڈاؤوڈ یعنی او ایل ای ڈی کانام دیا یہ نیا ٹی وی اپنی منفرد لائٹس سے فنکشن کرے گا جس سے انرجی کی بچت ہوگی اور آج کل کے فور کے ٹی وی سے زیادہ صاف وشفاف تصویر پیش کرے گا علاوہ ازیں یہ حیرت انگیز ٹی وی کاغذ کی طرف باریک ہونے کیساتھ رول اور فولڈ کیا جاسکے گا کمپنی کے ترجمان کا کہنا ہے اس ڈبلیو سیریز یعنی وال پیپرز کی موٹائی اندازً دو سے تین ملی میٹر ہو گی مقناطیسی سسٹم سے دیوار میں ایڈجسٹ کیا جاسکے گا عام استعمال کے لئے اس سال کے آخر میں مارکیٹ میں دستیاب ہو گا۔لیڈ لیمپ۔عام بلب یا انرجی سیور لیمپس بہت جلد مارکیٹ سے ہٹا دئے جائیں گے انکی جگہ پر کرنے کیلئے اولیڈ لیمپ دستیاب ہونگے ان نئے لیمپ کا موازنہ ایل جی کے ٹی وی سسٹم سے کیا جا سکتا ہے معروف کمپنیز فلپس اور اوسرام بہت جلد یہ لیمپ متعارف کروائیں گی۔ سٹوریج میڈیا۔آج کل سی ڈیز ، ڈی وی ڈیز ڈسک کے علاوہ یو ایس بی سٹکس پر تمام ڈیٹا منتقل کرنے کے بعد سٹوریج کیا جاتا ہے جبکہ آنے والے برسوں میں یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا اور اسکی جگہ بوکس، ایمزون اور گوگل کمپنیز ایک نیا سٹوریج میڈیا متعارف کروائیں گے جس میں وائی فائی سسٹم کے تحت اَن لمیٹڈ ڈیٹا سٹور کیا جا سکے گا ۔گیم کونزولز۔گیمز کھیلنے والے یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کنٹرولر یا دیگر کونزولز کے بغیر اپنی من پسند گیم ایکس بوکس یا پلے سٹیشن پر کھیل سکیں لیکن مستقبل قریب میں این وائی ڈیا کمپنی کونزولز فری کلاؤڈ گیم سسٹم متعارف کروائے گی جس سے گیمز کھیلی جائیں گی یہ کمپنی جی فورس ناؤ گیم سٹریمنگ سروس کے ذریعے گیم کھیلنے والوں کیلئے سہولت پیدا کرے گی علاوہ ازیں اپ لوڈ اور ڈاؤن لوڈ سسٹم کو بھی ریموٹ سرور کے ذریعے ہائی ٹیک طریقے سے استعمال کیا جا سکے گا۔کیبل چارجرز۔سیمنگ کمپنی نے حال ہی میں کیبل فری چارجر متعارف کروایا ہے ایک مخصوص پیڈ کے ذریعے سمارٹ فونز ،لیپ ٹاپ اور دیگر الیکٹرونک انسٹرومنٹس چارج کئے جا سکیں گے ،پلگ یا ایڈیپٹر کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی،ایپل کمپنی نے بھی کیبل فری ایک نئی ٹیکنالوجی متعارف کروائی ہے جس سے تمام آلات کیبل کے بغیر چارج کئے جائیں گے۔ریموٹ کنٹرولز۔پروگرامنگ اور دیگر فنکشن کے لئے ریموٹ کنٹرول کی بجائے وائس سسٹم سے تمام آلات فنکشن کریں گے اس سسٹم کیلئے سینسور استعمال کیا جائے گا مثلاً ایکس بوکس یا پلے سٹیشن کو ٹی وی کے والیم سے منسلک کرنے کے بعد وائس کنٹرول سے استعما ل کیا جاسکے گا ۔پلاسٹک کارڈز اور پاس ورڈز سسٹم بھی بہت جلد ختم کرنے کے بعد تمام ڈیٹا سمارٹ فونز پر منتقل کرنے سے ہر قسم کی شاپنگ کی جاسکے گی بائیو میٹرک سینسر اور ہائی ٹیک الفا بیٹک سسٹم کے علاوہ فنگر پرنٹس اور چہرے کی شناخت سے تمام عوامل باآسانی طے پائیں گے۔انسان ایک طرف کہتا ہے کہ سائنس ترقی کر رہی ہے ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور دوسری طرف سائنسدانوں کو برا بھلا بھی کہا جاتا ہے ۔چارلی چپلن آج زندہ ہوتا تو بہترین ایکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم سائنسدان بھی ہوتاجو ہنستے ہنساتے بہت کچھ دریافت کرتا اور لوگ اس کی تعریف بھی کرتے۔

§§§

# کمپیوٹر وائرس

مصنف: یوسف اقبال

**کمپیوٹر وائرس** (Computer Virus) ایسا پروگرام ہے جو اپنے آپ کو ایک Computer سے دوسرے کمپیوٹر میں داخل کرتا ہے اور جس میں بھی وہ داخل ہوتا ہے اس کے ہارڈویئر یا سوفٹ ویئر میں چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔

## وائرس کا کام

وائرس کو اس طریقے سے ڈیزائن کیا جاتا ہے کہ وہ ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر میں منتقل ہوتے وقت یوزر کے علم سے بچ جائیں اور پتہ بھی نہ لگے کہ وائرس داخل ہوچکا ہے۔ جب وائرس کمپیوٹر میں داخل ہوجائے تو وہ کمپیوٹر کو اپنے کنٹرول میں لے لیتا ہے وائرس کی ان ہدایات کوجو کسی سسٹم کو خراب کرنے کا باعث بنتی ہے (Payload) کہا جاتاہے تاہم( پے لوڈ)کسی بھی فال یا پیغام کو خراب کر دیتاہے یا پھر اس کو بدل دیتا ہے ۔ لہذا کمپیوٹر کا نظام خراب ہوجاتا ہے۔

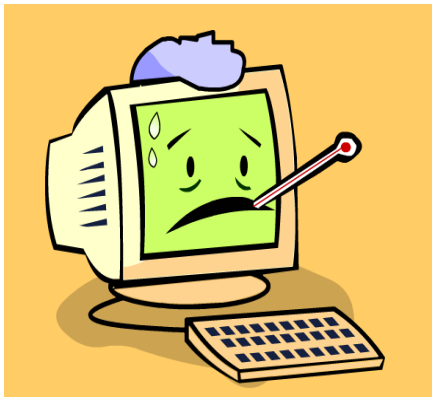

اور بھی ایسے پروگرام ہیں جو کمپیوٹر پروگرام کےلئے نقصان دہ ہے لیکن ان میں یکساں طور پر یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں کہ وہ خودبخود ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر میں منتقل ہوجائیں اور پھر ان کا کھوج بھی نہ لگایا جاسکے ۔ لیکن پھر بھی ایسے پروگرامز وائرس سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ کسی کھیل کی صورت میں آسکتے ہیں‌اور پھر اپنا کام دکھاتے ہیں ان میں سے بعض پروگرامز ایسے ہیں جو اس وقت تک عمل پزیر نہیں ہوتے جب تک وہ ایک خاص تاریخ یا وقت کو نہ پالیں۔اور پھر کسی مخصوص حرف کو یوزر ٹائپ نہ کرے ایسے بھی نقصان دہ پروگرامز سامنے آتے ہیں جو اپنے آپ کو کاپی کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کا حجم کمپیوٹر کی میموری پر حاوی ہوجاتا ہے اور اس طرح کمپیوٹر کا کام سست پرجاتا ہے۔

## وائرس کا اثرانداز ھونا

وائرس کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ وائرس ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر میں منتقل ہوتے ہیں اور جب وہ اپنا کام شروع کردیں تو پھر وہ کسی بھی فلیش ڈسک یا ہارڈڈرائیو جو ایک کمپیوٹر سسٹم کا حصہ ہے ان میں منتقل ہوجاتا ہے۔

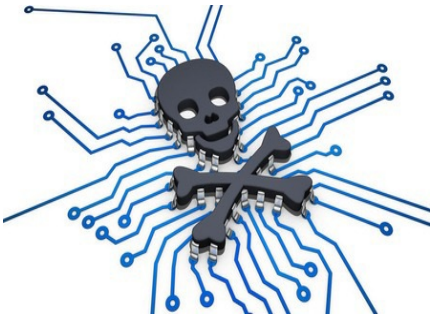

اور اس طرح سارے نیٹ ورک اور دوسرے کمپیوٹرز میں خرابیاں پیدا کرنے لگ جاتاہے ایسے وائرس عام طور پر Professional Main Frame Systemsکی نسبت Personal Computersمیں زیادہ پائے جاتے ہیں کیونکہ ان پروگرامز کو سی ڈیز یا فلیش ڈسک کے ذریعے پھیلایا جاتاہے۔ جو Personal Computers کمپیوٹر استعمال کرنے والوں کے کام آتی ہے۔ وائرسز صرف اس وقت عمل پزیر ہوتے ہیں جب ان کے پروگرام کو استعمال کیا جائے لہذا اگر کوئی کمپیوٹر کسی انٹرنیٹ ورک سے منسلک ہے ضروری نہیں کہ اس کمپیوٹر خرابی پیدا ہو تاہم ایسے وائر س پروگرام ہیں جو کمپیوٹر یوزر کو لالچ دے کر اپنا پروگرام استعمال کرواتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض ایسے وائرس ہیں جو کسی اچھے پروگرام کے ساتھ اٹیچ ہوجاتے ہیں لہذا جب ان پروگرام کو چلایا جاتا ہے تو وائرس بھی ایکٹو ہوجاتے ہیں۔

## وائرس کی تاریخ

1949ء میں ہنگری کا ایک باشندہ جو امریکہ میں قیام پزیر ہوچکا تھا یعنی (John Von Neumann) نے نیوجرسی کی ایک انسٹی ٹیوٹ میں یہ ارادہ کیا کہ اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ کیا کمپیوٹر پروگرام ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر میں خود بخود منتقل ہوسکتے ہیں‌یا نہیں لہٰذا 1950ء کی دہائی میں ایک ایسی کھیل بنائی گئی جس کے نتیجے میں اس کھیل کوکھیلنے والے چھوٹے چھوٹے کمپیوٹر پروگرام بناتے تھے جو اپنے حریف کے سسٹم پر حملہ آور ہوتے تھے اور اسکے پروگرام کو مٹانے کی کوشش کرتے تھے۔

1983ء میں ایسے پروگرامزکو وائرس کانام دیا گیا۔1985ء میں وائرس سے ملتے جلتے پروگرام سامنے آئے جس کے نتیجے میں وائرس پروگرام کو ترقی ملی 1986ء میں برین وائرس (Brain Virus) سامنے آیا۔جو ایک سال کے اندر اندر ساری دنیا میں پھیل گیا۔ 1988ء میں ایک وائرس کا پتہ لگا جس نے پوری یونائیٹڈ اسٹیٹ میں تہلکہ مچا دیااور اسی طرح 1990ء کی دہائی میں اور اسکے بعد تک وائرسز کی اقسام بہت ہی پیچیدہ ہوگئی.

§§§

# دس نکاتی صحت بخش منشور

مصنف: علی احمد

### اس قدر کام کریں کہ پسینہ آجائے :

کھائی ہوئی غذا کو بہتر طور پر جزوبدن بنانے کے لیے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ آپ اپنے جسم سے خوب ڈٹ کرکام لیں۔ بامقصد دوڑ بھاگ اور جسمانی کارکردگی اور سرگرمی کے باعث آپ کی غذا (Consume digest) ہو کر اس کی زیادہ سے زیادہ اکائیں جزوبند بنیں گی۔ آپ اس قدر کام کریں کہ آپ کو پسینہ آنے لگے۔ کام کرنے کے دوران اور کام کرچکنے کے بعد آپ کو ایک خوشگوار اطمینان کااحساس حاصل ہوگا۔

### کھانے کی مقدار کو کم کردیں :

آپ صبح سے شام تک اپنے کھانے کی کل مقدار کو دوتہائی کردیں لیکن یہ بھی متوازی طور پر اہتمام کریں کہ آپ تین کی بجائے چھ بار غذالیں۔ آپ ہر بار اپنی غذا میں نمایاں طور پر تبدیلی لائیں۔ کچی اور ادھ پکی سبزیاں، پھل، ڈرائی فروٹ ، سلاد بسکٹ، انڈہ، گوشت ، مچھلی ، دالیں ، اجناس ، تمام قسم کی غذاؤں پر مبنی ایک ہفتہ اور چارٹ تیار کرلیں تاکہ آپ کو بہتر طور پر " غذائیت " حاصل ہوسکے ۔ اس چارٹ میںآ پ جسم کے ضروری وٹامنز اور پروٹینز پر مبنی غذاؤں کی ترجیح دیں تاکہ آپ میں مطلوبہ توانائی کی مقدار ہمیشہ قائم رہے ۔

### اپنے جذبات ومحسوسات کا کھل کراظہار کیجیے :

آپ اپنے چہرے اور طرز عمل پر سنجیدگی طاری نہ کریں، اس طرح نہ تو دوسرے لوگوں پر آپ کی " دانشوری" کا رعب پڑے گا اور نہ ہی آپ کی اپنی ذات کو کسی بھی پہلو سے فائدہ حاصل ہوگا۔ آپ اپنی قلبی، جسمانی اور ذہنی کیفیات ، جذبات اور محسوسات کااظہار کھل کرکیا کریں۔ آپ کی زبان اور چہرے سے آپ کے قلب وذہن کی حالت عیاں ہونی چاہیے۔ یہی سچی، کھری اور خالص حکمت عملی ہے۔ آپ کے فقا، افرادخانہ، رشتہ دار اور شرکاء کار آپ کی ہرخوشی اور غمی میں برابر کے شریک ہوں گے ۔ آپ واقعی محسوس کریں گے کہ وہ آپ کے کس قدر قریب ہیں اور آپ " تنہا " نہیں ہیں ۔

### اپنے ذوق جمال میں خوب اضافہ کریں :

آپ اپنے انداز کی جمالیاتی حس اور ذوق میں اضافہ کریں اور اسے اپنے عمل، رویے اور طرز عمل سے اس کا برملااظہارکریں۔ آپ کی شخصیت ، لباس، گھر دفتر اور آپ کے پورے ماحول میں جمالیاتی تاثر آپ کے ذہن ، وقلب کو ہروقت تروتازہ اور خوشگوار رکھے گا۔ آپ کو زندگی کا صحیح لطف آنے لگے گا۔ آپ کی نفاست، عمدگی ، شائستگی، قرینہ ، آداب اوررکھ رکھاؤ دیکھ کر لوگ آپ پررشک کرنے لگیں گے، وہ آپ کے قریب ترہو جائیں گے۔ آپ کے باطن میں ایک تفاخر اور اطمینان کااحساس جنم لینے لگے گا اور آپ ایک روحانی خوشی محسوس کریں گے ۔

### سیر، تفریح میں باقاعدگی پیدا کریں :

آپ صبح کو ورزش اور سیر، شام کو چہل قدمی اور کوئی تفریح ، ان چاروں سرگرمیوں کو آپ اپنے معمولات زندگی میں باقاعدگی سے شامل کرلیں اور ہرروزاس کی عملی طور پر پابندی کریں۔ ان مفید سرگرمیوں کی بدولت نہ صرف آپ جسمانی طور پر چست وچوبندرہیں گے بلکہ آپ قل ذہنی طور پر خوش ، مطمئن اور تازہ رہیں گے ۔ آپ کی ہر غذا بہتر طور پر جزوبدن بنے گی اور آپ کو پرسکون نیندآنے لگے گی۔ آپ کے اندر نئی امنگ پیداہوگی، آپ کی قوت تخلیق کو جلا حاصل ہوگی اور آپ کے خیالات میں مثبت پہلو غالب آنے لگے گا۔

### گائیکی اور رقص جیسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیں :

آپ فنون لطیفہ یافنون مفیدہ سے ضرور تعلق رکھیں۔ آپ مصوری، پینٹنگ ، گائیکی اور موسیقی یارقص جیسے لطیف اور ذی جمال مشاغل میں عملی دلچسپی لیں۔ یہ تفریحی سرگرمیاں نہ صرف آپ کے ذہن میں طمانیت ،سرور اور سکون کی کیفیت میں اضافہ کریں گی بلکہ آپ جسمانی طور پور بھی چستی اور خوشگواری محسوس کریں گے ۔ آپ کی دن بھرکی معاشی کارکردگی پراس مشغلہ کے خوش کن اثرات مرتب ہوں گے۔ آپ کے انداز فکر میں وسعت اور روشن خیالی کا عنصر عودکرآئے

### تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لیں :

جس طرح موٹر کار پٹرول سے چلتی ہے، اسی طرح انسان آکسیجن سے زندہ رہتا ہے۔ یہ انتہائی شکر کی بات ہے کہ قدرت نے ہمیں آکسیجن سے پرتازہ ہوا" مفت " دے رکھی ہے۔ آپ قدرت کے شکر کے طور پر ہرروز صبح کے وقت کھلی فضا میں کم ازکم پندرہ منٹ کے لیے لمبے لمبے سانس لینے کو اپنا لازمی معمولی بنالیں ۔ اس عمل سے نہ صرف آپ کا نظام تنفس درست رہے گا بلکہ جسم کے تمام نظام بہتر طور پر کام کرتے رہیں گے اور ساتھ ہی سارا دن آپ کاذہن بھی تازگی محسوس کرتارہے گا۔ دن کے باقی حصے میں بھی جب بھی موقع ملے آپ پانچ منٹ کے لیے یہ عمل کرلیا کریں ۔

### اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجا کررکھیں :

آپ کو قدرت عالیہ نے نہایت عمدھی کے ساتھ خوبصورت تخلیق کیا ہے ۔ آپ کے سراپے مین اس نے کس قدر تناسب کے ساتھ تمام اعضاء کو کمال استعدادیں عطا کر دی ہیں۔ آپ اگر اپنے کو زیادہ دلکش اور جاذب نظر بنانے کے لیے اپنے چہرے پر مسکراہٹ طاری رکھیں تو آپ کو اس امر کے لاتعداد فوائد حاصل ہوں گے۔ تاثرات سے خالی، سپاٹ، حیران وپریشان چہرے پر دنیا اور بھی لعنت بھیجتی ہے۔ دنیا میں خود خوش رہنے ،خوشیوں کو جذب کرنے ، دوسروں میں اپنی خوشیاں بانٹنے کے عمل میں سچی طمانیت کاراز مضمر ہے۔ اس ضمن میں پہلا قدم اور سبق یہ ہے کہ آپ اپنے چہرے پر کم ازکم مصنوعی مسکراہٹ سجانا سیکھ لیں، یقینا کئی مسائل حل ہوجائیں گے ۔

### ذہن سے کام لے کر کوئی قابل ذکر تخلیقی کام کریں:

جس طرح باغ میں ہر پودا پھول دے رہا ہے،ہر پھول اپنی رعنائی، رنگ ، ڈیزائن اور خوشبو کے غرور میں جس طرح خوشی سے لہرایا رہاہے۔ آپ بھی اپنے ذہن سے تعمیری کام لے کر ہر ہفتے فارغ وقت نکال کر کوئی تخلیقی کام کیا کریں۔ عین ممکن ہے آپ کا تحقیقی اور تخلیقی کام دنیا کے لیے ایک مفیدپراجیکٹ کی طرح مقبول ہوجائے اور اس کے باعث آپ کاکارنامہ تاریخی یاد گار اور اختراعی شاہکار کادرجہ حاصل کرے ۔ جب آپ کسی تخلیقی سرگرمی میں مصروف ہوں گے تو آپ کے جسم اورذہن میں کئی خوش کن تبدیلیاں رونما ہوں گی اور آپ ایک پراسرار مسرت، طمانیت ، رمق اور تازگی کانیا احساس پائیں گے جو آپ کے لیے ایک خوش کن تجربہ ہوگا۔

### آنے والے ہر " کل " کے لیے پرامیدرہیں:

قدرت عالیہ کابہت شکر ہے کہ وہ ہمیں ہرآنے والے کل کے " حالات وہ واقعات کی آگہی " سے بے خبر رکھتی ہے۔ یہ " بے خبری " حقیقت میں " خیریت اور عافیت اور اطمینان " کاخزانہ ہے اور ہر خوف اور اندیشوں سے نجات کا ایک خوبصورت بہانہ ہے۔ آپ آنے والے ہر " کل " کے لیے اچھی، روشن اور خوش کن امید رکھیں،اس امید کے باعث نہ صرف آپ کا "آج " نہایت خوشگوار رہے گا بلکہ آپ کی یہ "خوشی فہمی اور حسن ظن " آنے والے کل کے لیے حقیقی خوشی کے حصول کی ٹھوس ضمانت ہے۔ آپ کاہر "آج " کادن خوشگواریت کے ساتھ گزرے گا تو آپ کے ماضی کا ہر گزرا ہوا" کل " بھی اچھی یادوں کا خزانہ بنتا جائے گا۔

§§§

# مربوط ترقی کا راز

مصنف: سفیان خان

خلفا و راشدین کے بادشاہوں کے درباروں تک صلاح و مشورے اور پبلک پالیسی کے سلسلے میں کیا جانے والا مشاورت کا سفر منازل طے کرتا ہوا آج کی جدید دنیا میں تھنک ٹینکس کی صورت اختیار کر چکا ہے جن سے نا صرف حکومتیں بلکہ افراد و کاروباری ادارے بھی مستفید ہو رہے ہیں۔پوری دنیا کے معاشی و اقتصادی معاملات کو ایک سرکلر میں جکڑنا ہو یا تہذیبوں کا ٹکراؤ کرانا ہو یا دنیا کی جنگوں کو ڈائیلاگز کی مدد سے جیتنا ہو یا پھر دنیا کو Dominant کرنے کی پلاننگ ہو یا پھر مخالف نظریات رکھنے والوں کو خانہ جنگی میں الجھا کر اپنے عزائم کو پورا کرنے کی جستجو ان تمام مقاصد کے حصول کیلئے امریکہ سمیت پوری مغربی دنیا جس قوت کی محتاج ہے وہ تھنک ٹینکس ہی ہیں جس میں مختلف Fields Of Lifeکے مکاتب فکر مل بیٹھ کر کسی ایک مسئلہ کے حوالے سے مشاورت کرتے ہیں اور اپنی سفارشات متعلقہ حکومتی اداروں کو فراہم کرتے ہیں انہی سفارشات کی روشنی میں حکومتیں پالیسیاں بناتی ہیں اور پھر نتائج دنیا دیکھتی ہے۔عالمگیریت کے اس دور میں بقاء ترقی اور اختیار صرف ان ہی کو حاصل ہیں جو علم، تجربہ اور مہارت کی بنیاد پر مرتب کردہ مشوروں کو اپنی قلیل اور طویل المدتی پالیسیوں کا حصہ بناتے ہیں اور ان کے تسلسل کو جاری رکھتے ہیں مشاورت کا یہ عمل آج دنیا میں 6846 تھنک ٹینکس کی شکل میں موجود تحقیق اور حقائق کی پرکھ سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں پالیسی سازی کرتے ہیں اس طرح کئی ممالک تو ترقی کی راہ میں کہیں آگے نکل گئے ہیں تو کئی ابھی راستے کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں ۔ امریکہ سپر پاور ہونے کی حیثیت سے اس وقت دنیا کے 27 فیصد تھنک ٹینکس رکھتے ہوئے سب سے آگے ہے اس ترقی کی دوڑ میں سب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے یہ اپنے حکومتی معاملات سے سوسائٹی اور میڈیا کی مشاورت و رہنمائی اور معلومات تک کی رسائی کیلئے ان سے استفادہ کرتا ہے اور ان کے مشوروں کو انتہائی قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھتا اور اپنی پالیسیاں انہی کی روشنی میں ترتیب دیتا ہے۔ اس کے برعکس ترقی پذیر ممالک خصوصاً وطن عزیز میں تھنک ٹینکس سے استفادہ کی صورتحال کوئی اتنی حوصلہ افزا نہیں۔دراصل تھنک ٹینکس پبلک پالیسی کی تحقیق اور تجزیہ میں مصروف ایسے ادارے ہیں جو مقامی اور بین الاقوامی مسائل پر پالیسی، تحقیق، تجزیہ اور صلاح و مشورے دیتے ہیں۔

اس کی تعریف کچھ اس طرح سے کی گئی ہے کہ افراد کا ایسا گروہ جس کو پیسے دیئے جاتے ہیں کچھ نہیں کرنے کے سوائے پڑھنا۔ Discuss کرنا، سوچنا اور لائحہ عمل تیار کرنا۔ یہ ایک ایسی ریسرچ یونیورسٹی ہے جس میں نہ شاگرد ہیں اور نہ استاد صرف ریسرچ اور ریسرچ ہوتی ہے جو ان کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ان کا بنیادی کام حکومت کو اندرونی و بیرونی مسائل کے حوالے سے اپنی Findings اور معلومات بذریعہ میڈیا، کانفرنسز، آرٹیکلز اور کتابوں کی صورت میں فراہم کرنا ہے جن میں مسئلہ کے حوالے سے کئی اہداف چھپے ہوئے ہوتے ہیں جن میں ملکی سالمیت عالمی و پبلک بہتری وغیرہ شامل ہیں۔افلاطون کے مطابق یہ تھنک ٹینکس سیاستدانوں کوسوچنے کا لائحہ عمل اور مواد فراہم کرتے ہیں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ To Hep The Govt To Think یعنی گورنمنٹ کیلئے Supporting Role کا کام کرتے ہیں۔یہ تھنک ٹینکس ایسی آرمی کے طور پر جانے جاتے ہیں جو سوچ کو بدلتے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر Actual آرمی کام کرتی ہے۔ زیادہ تر امریکہ کے جتنے بھی تھنک ٹینکس ہیں ان کے اہداف امریکہ کی Supermacy اور اس کے ذاتی مفادات پر ہی ختم ہوتے ہیں۔ اقوام متحدہ دراصل تھنک ٹینکس کی سوچ کی ہی ایک شکل ہے۔ان کی فارن پالیسی میں Level Consistent پایا جاتا ہے اور ان میں Clearity پائی جاتی ہے۔ جو کہ تھنک ٹینکس کی طرف سے تشکیل کردہ ہوتی ہیں لہٰذا صدور کی بدلی اس میں کوئی فرق نہیں لا پاتی۔

یہ زیادہ تر خاص سطح پر کام کرتے ہیں جن میں حکومت، پرائیویٹ سیکٹر اور دیگر اہم گروپس اور ادارے شامل ہیں اور ان کی تحقیقات حقائق پر مبنی ہوتی ہیں نہ کہ اپنی انفرادیت پر۔ تھنک ٹینکس میں وہ لوگ شامل ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ، محقق اور وسیع المطالعہ ہوتے ہیں یہ اپنے خیالات کو متعارف کرواتے ہیں جو تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں۔امریکہ میں سوشل یونیورسٹیز میں بھی تھنک ٹینکس موجود ہیں جس میں وہ اپنی تحقیق Class Room تک لاتے ہیں اور اپنی سفارشات متعارف کراتے ہیں وہاں یہ بہت عام سی بات سمجھی جاتی ہے کہ پروفیسرز ایک دو سال کی چھٹی پر جا کر حکومت کے ساتھ کام کرتے ہے۔دنیا کا پہلا تھنک ٹینک جو کہ 1824ء میں امریکہ میں دی فرینکلن انسٹیٹیوٹ Franklin Institute Theسے ملتا جلتا تھا جس کا کام Franklin Benjamin کو خراج تحسین پیش کرنا اور ان کی ایجادات کو بڑھانا تھا۔ دنیا کا پہلا سیاسی تھنک ٹینک The Society Fobian ہے جو برطانیہ میں 1884ء میں قائم ہوا۔ تھنک ٹینک کی باقاعدہ اصطلاح D Corporatio RANسے نکلی ہے جس نے امریکہ کیلئے سٹرٹیجک سوچ و بچار کا محفوظ ماحول فراہم کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس طرح کے ادارے دنیا بھر میں پھیلنے لگے اور اب 197 ممالک میں تھنک ٹینکس موجود ہیں۔ 2015ء کی رپورٹ کے مطابق 1835ء کی تعداد کے ساتھ امریکہ پہلے نمبر پر، چین 435 کی تعداد کے ساتھ دوسرے جبکہ برطانیہ 288 کی تعداد کے ساتھ تیسرے نمبر پر ہے۔

ان ترقی یافتہ ممالک کی پوزیشن سے ان کی ترقی و بقاء و خو مختاریت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں اس طرح سے تھنک ٹینکس موجود نہیں اور نہ ہی ریاستیں اس طرح سے ان سے مستفید ہو رہی ہیں۔ حالانکہ حکومتیں ان کی اہمیت و نوعیت سے بخوبی آشنا ہیں اور انہیں کسی حد تک اہم بھی گردانتی ہیں مگر ابھی ان کی وہ Capacity نہیں ہے یہ معاملات پاکستان میں ابھی پیچیدہ ہیں جب تک تعلیم کو اہمیت نہیں دی جائے گی کوئی یقینی صورتحال نہیں نکالی جا سکتی۔حکومتوں میں بھی Awarness اورClearity in terms نہیں ہے یہ اس چیز سے بے خبر ہیں کہ پاکستان کو کہاں لے کر جانا ہے۔ یہ صرف Anti Govt لوگوں کو Deal کرنا جانتے ہیں یہاں Anti State سے زیادہ Govt Anti زیادہ Crisis کا شکار ہے۔ کوئی مقاصد و ہدف نظر نہیں آتے اور نہ پاکستان کیلئے کوئی ایک Direction ہے جتنے لوگ اتنی ہی پالیسیز ہیں۔پاکستان کے سروے باہر کی کمپنیاں بیٹھ کر کر رہی ہیں Rating باہر کی جاتی ہے اور پالیسیاں بھی باہر سے بن کر آتی ہیں۔ پھر ایسے میں پاکستان کس حد تک کامیابی کی طرف جا سکتا ہے جب بیرونی تھنک ٹینکس پاکستان کیلئے کام کریں گے تو وہ پہلے اپنے مفادات کو پورا کریں گے اور پھر کہیں امدادی کارروائی کریں گے ۔

§§§

# معاشی سفر کے تضادات

مصنف: سفیان خان

بنگلہ دیش جو ہم ہی سے الگ ہوا تھا 1972 میں اسکی جی ڈی پی کی شرح نمومنفی13.97فیصدتھی مگر آج اسکی شرح نموثبت7.1فیصدہے۔1972میں بھارت کی شرح نمو 1.643تھی مگر آج اسکی شرح نمو 8.2فیصد ہے جبکہ آج پاکستان کی شرح نمو 4.7فیصد ہے۔اسی طرح 1979تک چین کی معاشی حالت بھی تباہی کا شکار تھی مگر سمت کے تعین اور اس سمت پرنیک نیتی اورجانفشانی سے عمل کرنے کے سبب آج چین دنیا کی سب سے مضبوط معاشی طاقت بن چکا ہے۔ اسکے علاوہ 1984 تک تھائی لینڈ میں بھی معاشی حالات کچھ زیادہ بہتر نہ تھے اورتھائی بھات مسلسل گراوٹ کا شکار تھا مگر اب تھائی لینڈ404.82ارب ڈالرز کی جی ڈی پی کے ساتھ انڈونیشیاء کے بعدساؤتھ ایسٹ ایشیاء کی سب سے بڑی معاشی طاقت ہے۔مگر پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ ہم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی جانب گامزن ہیں جبکہ ہمارے ارباب اختیار پاکستان کو دو سالوں میں ملک کو دنیا کی پندرہویں بڑی معیشت بنانے کا دعویٰ کررہے ہیں اور بچت کی شرح کو بیس فیصد سے زیادہ کرنے کے دعوے کررہے ہیں۔مگر حقیقتاً قرض زدہ، بھیک کے سنہرے ورق میں لپٹی ہوئی اور مختلف عطیوں سے معطر معیشت کو ہم خود انحصاری کے مصنوعی لبادے میں پیش کررہے ہیں اور نادیدہ زنجیروں میں لپٹی معیشت کو آزاد وخودمختار بنانے کے نعرے لگارہے ہیں جبکہ ٹیکس کے دائرہ کار کو بڑھانے ، نئے پیداواری شعبوں کو وسعت دینے اور اندرونی و بیرونی سرمایہ کاری میں اضافہ کرنے کے بجائے ہماری مختلف حکومتیں اندرونی وبیرونی قرضوں کے حصول ، بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی ترسیلات پر انحصار کرکے ہی اپنے منصوبے بناتی رہی ہیں بلکہ اب تو حد یہ ہوگئی ہے کہ اس وقت ایئر پورٹس، موٹر ویز اور سرکاری عمارات کو گروی رکھ کر قرضوں کے بوجھ کو بڑھایا جارہا ہے ۔ قیام پاکستان سے پاکستان قرضوں میں ڈوبا ہوا نہیں تھا لیکن گذشتہ پندرہ بیس سالوں میں پاکستان زیادہ مقروض ہوا ہے۔ 1990میں پاکستان پر بیرونی قرضہ 20.9 ارب ڈالرز تھا جو اگلے دس سالوں میں بڑھ کر 2000 میں 38.9 ارب ڈالرز تک جاپہنچا۔

اسکے بعد اگلے دس سالوں میں بیرونی قرضے میں کمی بیشی ہوتی رہی جیسے2001میں 38ارب ڈالرز ہوا اور پھر 2002 میں 31.5 ارب ڈالرز ہوا۔ پھر 2010 میں پاکستان پر بیرونی قرضہ 53.62 ارب ڈالرز کی سطح پر پہنچا جس کے بعد بتدریج اضافے کا رجحان اب تک جاری ہے 2011 میں 57.21 ارب ڈالرز، 2012 میں 61.83 ارب ڈالرز، 2013 میں 56.19 ارب ڈالرز اور اب مرکزی بینک کی مارچ 2017 کی رپورٹ کے مطابق پاکستان پر بیرونی قرضوں کا بوجھ70.65 ارب ڈالرز ہوچکا ہے جوکہ پاکستانی روپے کیمطابق 7403.6 ارب روپے بنتا ہے جس میں بیرونی ادائیگیوں کا بوجھ365 ارب روپے اور قرضوں پر سود کی رقم کی ادائیگی شامل نہیں ہیں۔ اسکے علاوہ پاکستان پر اندرونی قرضوں اور ادائیگیوں کا بوجھ بھی بڑھتا ہوا 14192.6ارب روپے کی سطح پر پہنچ گیا ہے۔ یعنی کل ملا کر پاکستان پر اندرونی وبیرونی قرضوں اور ادائیگیوں کا بوجھ 23143 ارب روپے یعنی 220 ارب ڈالرز سے زائد ہے جوکہ پاکستان کی جی ڈی پی کا 80 فیصد سے زائد بنتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ گذشتہ چار سالوں سے موجودہ حکومت ملک کی معیشت کو ایک مستحکم معیشت کے سرٹیفیکٹ مختلف مالیاتی اداروں سے لے رہی ہے اور زرمبادلہ کے ذخائر میں اضافہ کو اپنی سب سے بڑی کامیابی قرار دے رہی ہے مگر اعدادوشمار کے ہیر پھیر سے معیشت مستحکم نہیں ہوسکتی کیونکہ 2005 میں پاکستان میں زرمبادلہ کے ذخائر 12.58 ارب ڈالرز تھے جبکہ اس وقت ہم پر صرف بیرونی قرضہ 33.92 ارب ڈالرز تھا مگر اب جبکہ زرمبادلہ کے ذخائر 21.74 ارب ڈالرز کی سطح پر تو پہنچ گئے ہیں مگر بیرونی قرضہ بھی اس تناسب سے 70ارب ڈالرز سے زائد ہوچکا ہے۔ اسکے ساتھ برآمدات میں بھی پانچ ارب ڈالرز کی کمی آچکی ہے اور درآمدات میں اضافے کے ساتھ مالیاتی خسارے بھی خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔ جیسا کہ 2000-1 کے مالی سال میں ہمارا مالیاتی خسارہ 1.52 ارب ڈالرز تھا جو کہ 2015-16 میں بڑھ کر 23.96 ارب ڈالرز تک پہنچ گیاتھا اور اب مرکزی بینک کے مطابق جولائی 2016 سے مارچ 2017 کے نو ماہ ہماری برآمدات 15.12 ارب ڈالرز اور درآمدات 38.5 ارب ڈالرز ہونے کی وجہ سے مالیاتی خسارہ 23.38 ارب ڈالرز ہوچکا ہے اس لئے میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ برآمدات میں کمی، درآمدات اور مالیاتی خسارے میں اضافے اور اندرونی و بیرونی قرضوں کے بڑھنے کے باوجود ملکی معیشت مستحکم و مضبوط کیسے قرار دی جاسکتی ہے ؟ کیا صرف بیرونی مالیاتی اداروں کے مستحسن سرٹیفیکیٹس اور قرضوں و بھیک کی آمد سے زرمبادلہ میں مصنوعی اضافے کو کامیابی سمجھا جاسکتا ہے؟ کیونکہ زرمبادلہ کے ذخائر اکتوبر 2016 میں تاریخی بلندی یعنی 24.025 ارب ڈالرز تک پہنچ گئے تھے مگرحکومت کی مصنوعی پالیسیوں اور مسلسل گرتی ہوئی برآمدات و مسلسل بڑھتی ہوئی درآمدات کے سبب سات اپریل 2017 کو زرمبادلہ کے ذخائر میں 2.28ارب روپے کی کمی ہوچکی ہے۔حکومت کی ان ہی مصنوعی اور زمینی حقائق سے غیر مطابقت رکھنے والی معاشی پالیسیوں کی وجہ سے گذشتہ دنوں سترہ اپریل 2017 کو ٹریڈ ڈویلپمنٹ اتھارٹی آف پاکستان جس کا کام ہی پاکستان کی برآمدات بڑھاناہے کے سربراہ اور ممتاز صنعتکار محترم ایس ایم منیر صاحب نے اپنے اعزاز میں منعقدہ ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ انہوں نے اپنا استعفیٰ وزیر اعظم پاکستان محترم میاں محمد نواز شریف صاحب کو پیش کرکے اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگئے ہیں کیونکہ انکے مطابق وزیر اعظم محترم میاں نواز شریف اور وزیر تجارت خرم دستگیر خان کے چاہنے کے باوجود بیوروکریسی تاجروں وصنعتکاروں کا ساتھ نہیں دے رہی جس کی وجہ سے پاکستان کے برآمدات کنندگان کے 300 ارب روپے کے ریفنڈ اب تک واپس نہ ہوسکے ہیں اور ہماری بڑی مثبت تجاویز پر مرتب فائلوں کو کامرس منسٹری نے گھمادیا ہے جبکہ انکم ٹیکس و سیلز ٹیکس کے اہلکار تاجروں وصنعتکاروں کو ہراساں کررہے ہیں اس لئے ان حالات میں جب میں تاجروں وصنعتکاروں کے مفاد میں کوئی کام کرنے سے قاصر ہوں ا س لئے میرا اس عہدے پر رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے ۔

مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی ملک ایڈہاک ازم اور مصنوعی اعدادوشمار کے سہارے معاشی استحکام حاصل نہیں کرسکتا اور اس کیلئے سب سے پہلی اور بنیادی ضرورت ٹیم ورک کی ہوتی ہے جو عملاً اور نیتاً مخلص ہو مگر پاکستان کی معاشی تاریخ گواہ ہے کہ اسکے معاشی، اقتصادی ، پلاننگ اور منصوبہ ساز اداروں میں بیٹھے افراد گذشتہ پچیس سالوں سے اپنے بیرونی آقاؤں اور انکے مقاصد کوپورا کرنے میں مگن ہیں اور حکومتیں اور وزراء آتے جاتے رہتے ہیں مگر وہ تمام افسران شطرنج کے کھیل کی طرح کبھی ایک سیٹ سے دوسری سیٹ پر براجمان ہوکر پاکستان کی معیشت کا بیڑہ غرق کرنے میں لگے ہوئے ہیں جس کی عملی صورتحال یہ ہے کہ ہم اپنی برآمدات اور پیداواری شعبے میں ترقی یافتہ ممالک تو کیا اپنے خطے میں موجود ممالک جو رقبے ،آبادی اور قدرتی وسائل میں بھی ہم سے بہت کم ہیں وہ بھی ہم سے کہیں زیادہ ترقی کرچکے ہیں جیسا کہ بنگلہ دیش کی برآمدات تقریباً38ارب ڈالرز یعنی پاکستان سے تقریباً دگنی ہیں اور درآمدات تقریباً 40 ارب ڈالرز ہیں یعنی مالیاتی خسارہ صرف تقریباً 2ارب ڈالرز ہے جبکہ بنگلہ دیش پر بیرونی قرضے کا بوجھ36ارب ڈالرز ہے جوکہ اسکی جی ڈی پی کا صرف 14فیصد بنتا ہے۔ اسی طرح تھائی لینڈ کی برآمدات215 ارب ڈالرزاور درآمدات 203 ارب ڈالرز ہیں یعنی مالیاتی خسارہ بالکل نہیں ہے جبکہ تھائی لینڈ پر بیرونی قرضوں کا بوجھ 15 ارب ڈالرز ہے جو اسکی جی ڈی پی کا 39

فیصد بنتا ہے اس لئے ہمیں اپنے ملکی زمینی حقائق اور وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے حقیقی معاشی ترقی کیلئے اقدامات اٹھانے چاہیے کیونکہ اگر ہم اخلاص اور نیک نیتی سے مثبت معاشی سمت کا تعین کرکے قدم بڑھائیں تو ہم ان ممالک سے کہیں آگے نکل سکتے ہیں کیونکہ نہ ہمارے ملک میں وسائل کی کمی ہے، نہ افرادی قو ت کی اور نہ ہی قابلیت کی۔ اس طرح ہم قرضوں و بھیک کی بیساکھی کو توڑ ہم اپنے ہی وسائل سے اپنے قدموں پر کھڑے ہوسکتے ہیں۔

§§§

# ایتھلیٹکس

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

پاکستان نے تین عشرے تک ایشین اور کامن ویلتھ گیمز سمیت دوسرے یورپی مقابلوں میں اپنی برتری قائم کی

پاکستان کے مرد ایتھلیٹ عبدالخالق کو ''فلائنگ برڈ آف ایشیاء'' ،خاتون کھلاڑی نسیم حمید کو ''ایشین اسپرنٹر کوئین'' کا خطاب ملا

ایتھلیٹکس1300 قبل مسیح میں ایجاد ہوا، اس کھیل میں تیز دوڑنا، لمبی، اونچی چھلانگ لگانا اور جویلین تھرو، شاٹ پٹ، ٹریک ریس اور کنٹری کراس ریس جیسے ایونٹ شامل ہوتے ہیں۔ 776ق م میں پہلے اولمپکس مقابلوں میں اسے بھی شامل کیا گیا تھا۔ 1880ء تک یہ کھیل دنیا کے کئی ممالک میں مقبول ہوا، وہاں اس کھیل کے انعقاد کے لیے متعدد ایسوسی ایشنز وجود میں آئیں۔ 1912ء میں انٹرنیشنل ایتھلیٹکس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا جو اس کھیل کی نگرانی کرنے والی عالمی تنظیم ہے۔ سویڈن میں ہونے والے اس کے پہلے اجلاس میں 17ممالک نے شرکت کی تھی۔ اکتوبر 1993ء میں اس کا ہیڈکوارٹر مناکو میں قائم کیا گیا، اس وقت تک یہ تنظیم انٹرنیشنل ایمیچرایتھلیٹکس فیڈریشن کے نام سے جانی جاتی تھی۔2001ء میں اس کا نام تبدیل کرکے انٹرنیشنل ایتھلیٹکس ایسوسی ایشن فیڈریشن کردیا گیا۔ اس کے زیر اہتمام ایتھلیٹک کی عالمی چیمپئن شپ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں ایتھلیٹک کا کھیل 1948ء سے شروع ہوا،1951ء میں ایتھلیٹک فیڈریشن آف پاکستان کا قیام عمل میں آیا، جسے انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فیڈریشن کی طرف سے منظوری دی گئی۔ 1962ء میں اس کی مجلس منتظمہ کے پہلے انتخابات کا انعقاد ہوا جن میں جسٹس اے آر کارنیلس پہلے صدر اور اے یو ظفر سکریٹری منتخب ہوئے۔ اب موجودہ صدر میجر جنرل محمد اکرم ساہی ہیں۔ مذکورہ تنظیم ایشین ایتھلیٹکس ایسوسی ایشن اور آئی اے اے ایف سے الحاق شدہ ہے۔ پاکستان ایتھلیٹکس نے 50سے 70کی دہائی میں عالمی سطح پر نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ 1970ء سے 1977ء تک محمد یونس نے جرمنی میں 1500,3000 اور 5000میٹر کی دوڑ میں طلائی تمغے اور اعزازات جیتے، وہ ایشین چیمپئن بھی رہے۔ ماضی میں اس کھیل کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل رہی لیکن حالیہ برسوں میں اسے نظر انداز کیا گیا، باصلاحیت کھلاڑیوں کو اولمپکس اور عالمی چیمپئن شپ جیسے اہم ٹورنامنٹس کے لیے تیار کرنے کی بجائے ان کی اس حد تک حوصلہ شکنی کی گئی کہ انہوں نے اس کھیل سے ہی کنارہ کشی اختیار کرلی۔ نسیم حمید کو 2010ء ساؤتھ ایشین گیمز میں جنوبی ایشین گیمز میں جنوبی ایشیاء کی تیز دوڑنے والی خاتون ایتھلیٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا، لیکن ملکی سطح پر پذیرائی نہ ہونے کے باعث انہوں نے اس کھیل سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ ماضی میں کئی ایتھلیٹس نے بین الاقوامی ٹورنامنٹس میں شہرت حاصل کی لیکن گزشتہ ایک عشرے سے یہ کھیل زبوں حالی کا شکار ہے۔ 50,60اور 70 کی دہائیوں میں پاکستان کے ایتھلیٹس کامیابیوں کے باب رقم کرتے رہے جب کہ ایشین ایتھلیٹکس پر پاکستان کی مدتوں حکم رانی قائم رہی۔

1948ء میں پاکستان کی ایتھلیٹکس ٹیم نے لندن میں 14ویں اولمپکس گیمز میں حصہ لے کر اپنے بین الاقوامی سفر کا آغاز کیا۔ 1952ء میں برسلز میں ہونے والی کراس کنٹری ملٹری ریس میں پاکستان کے پانچ رکنی دستے نے شرکت کی۔ اس ریس میں 9ممالک کے ایتھلیٹس نے شرکت کی اور پاکستان نے اس میں چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ 1952ء میں ہیلسنکی میں ہونے والے 15ویں اولمپکس گیمز میں پاکستان کے 18رکنی دستے نے شرکت کی جس میں 4اسٹیشل بھی شامل تھے۔ پاکستانی ایتھلیٹس دوسرے مرحلے سے آگے نہیں جاسکے۔ 1952ء میں لندن میں سہ ملکی مقابلے منعقد ہوئے جن میں پاکستانی کھلاڑیوں نے بھی حصہ لیا اور ان میں ان کی کارکردگی بہتر رہی۔1954ء میں منیلا ، فلپائن میں ہونے والے دوسرے ایشین گیمز میں پاکستانی ایتھلیٹس نے اولمپکس تجربوں کو بروئے کار لاکر کر مہارت کا مظاہرہ کیا۔ 1954ء میں وینکوور میں منعقدہ چیمپئن شپ میں پاکستانی ایتھلیٹس کے 9رکنی دستے نے شرکت کی اور پاکستان نےاس ٹورنامنٹ میں 4تمغے حاصل کیے۔ 1955ء میں انٹرنیشنل ملٹری ایتھلیٹ چیمپئن شپ مقابلوں میں پاکستان آرمی کے ایتھلیٹس نے شرکت کی۔ ان مقابلوں میں پاکستان نے کئی تمغے اور اعزازات حاصل کیے۔ پاکستان کے کئی کھلاڑیوں نے ایتھلیٹک کے کھیل میں عالمی شہرت حاصل کی، ان میں سے چند کا تذکرہ نذر قارئین ہے۔

## صوبیدار عبدالخالق

پاکستان کے برق رفتار ایتھلیٹ عبدالخالق کا تعلق پاکستان آرمی کی ایتھلیٹک ٹیم سے تھا، جنہوں نے اپنے ایتھلیٹک کیریئر کے دوران 36طلائی،15نقرئی اور 12کانسی کے تمغے جیتے۔ انہوں نے 1956س میں میلبورن اولمپکس،1960ء میں روم اولمپکس اور 1954ء کے ایشین گیمز میں شرکت کی اور اپنی کارکردگی سے عالمی سطح پر پذیرائی حاصل کی۔ ان کا شمار اولمپکس کے ایتھلیٹک کھلاڑیوں میں ساتویں نمبر میں ہوتا تھا۔ 1954ء میں دہلی میں منعقد ہونے والے ایشین گیمز میں انہوں نے 100میٹر کی دوڑ میں بھارت کے لیوی پنٹو کا ریکارڈ توڑا، جس پر انہیں'' دنیا کے تیز رفتار انسان'' کا خطاب دیا گیا، جب کہ بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، جو اس کھیل کی اختتامی تقریب کے مہمان خصوصی تھے،انہوں نے ان کے دوڑنے کا انداز دیکھ کر، انہیں ''ایشیاء کے اڑنے والے پرندے'' کا خطاب دیا، اس وقت ان کی عمر صرف 21برس تھی۔ انہوں نے ان مقابلوں میں 13تمغے حاصل کیے۔ 1955ء میں انہوں نے ایتھنز میں ورلڈ ملٹری گیمز میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ 1956ء میں انہوں نے دہلی میں منعقد ہونے والے ایتھلیٹکس مقابلوں میں 100اور 200میٹر کے ایونٹس میں ایشیاء کا نیا ریکارڈ قائم کیا، انہوں نے اس موقع پر دو طلائی تمغے جیتے۔ برلن میں ورلڈ ملٹری گیمز میں حصہ لے کر تین کانسی کے تمغے حاصل کیے۔ 1956ء میں میلبورن میں منعقد ہونے والے اولمپکس گیمز کے موقع پر ان کا کھیل عروج پر تھا۔ وہ ان مقابلوں میں 100اور 200میٹر کی دوڑ میں سیمی فائنل مرحلے تک پہنچ گئے تھے لیکن فائنل میں پہنچنے میں ناکام رہے۔ انہوں نے چوتھی پوزیشن حاصل کی اور تمغے کی دوڑ سے باہر ہوگئے۔ 1958ء میں ٹوکیو میں ایشین گیمز کے موقع پر انہوں نے ایک طلائی، ایک چاندی اور ایک کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ ڈبل ایمپائر گیمز میں وہ تیسرے نمبر پر رہے اور انہوں نے کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ قاہرہ میں ہونے والے ایتھلیٹ مقابلوں میں بھی ان کی کارکردگی بے مثال رہی اور انہوں نے ان مقابلوں میں دو طلائی تمغے حاصل کیے۔ 1962ء میں ہالینڈ میں منعقد ہونے ولے ورلڈ ملٹری گیمز میں انہوں نے کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ اپوہ ملائشیا میں بین الاقوامی ایتھلیٹک چیمپئن شپ میں انہوں نے ایک کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ 1962ء میں جکارتہ میں منعقد ہونے والے ایشین گیمز میں عبدالخالق سیمی فائنل مرحلے میں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے لیکن فائنل میں ہار گئے۔ ان کا شمار پاکستان کے ان کھلاڑیوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے ایتھلیٹکس کے کھیل میں پاکستان کو نمایاں مقام دلوایا۔

## لیاقت علی

لیاقت علی کا شمار بھی پاکستان کے با صلاحیت ایتھلیٹس میں ہوتا ہے۔ وہ پاکستان آرمی کی جانب سے ایتھلیٹک مقابلوں میں شرکت کرتے رہے اور اپنے ملک کو اس کھیل میںعالمی مقام دلوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے اپنے کیریئر کی ابتداء قومی ایتھلیٹک چیمپئن شپ کے مقابلوں سے کی اور2009ء میں قومی چیمپئن کا اعزاز حاصل کیا۔2010ء میں ساؤتھ ایشین گیمز میں کانسی کا تمغہ جیتا۔ 2012ء میں لندن میں سمر اولمپکس کے مقابلوں میں انہوں نے پاکستان کی نمائندگی کی اور انہیں ''وائلڈکارڈ'' کا اعزاز ملا۔ انہوں نے اس ٹورنامنٹ میں مردوں کی 100میٹر کی دوڑ میں چوتھی پوزیشن حاصل کی۔وہ 2009اور 2013میں عالمی ایتھلیٹکس چیمپئن شپ میں پاکستان کی نمائندگی کرچکے ہیں۔ 2013ء کے سیف گیمز میں انہوں نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

## حیدر علی شاہ

پاکستان کے مایہ ناز ایتھلیٹ ہیں جنہوں نے 2016ء کے ریو اولمپکس میں پاکستان کے لیے واحد جب کہ کسی بھی اولمپک مقابلے کا پہلا تمغہ حاصل کیا۔ انہوں نے

2008ء بیجنگ میں پیرا لمپکس کے موقع پر ایتھلیٹک کی نئی تاریخ مرتب کی۔ انہوں نے ان مقابلوں میں نہ صرف چاندی کا تمغہ جیتا بلکہ 6.44میٹر طویل چھلانگ لگا کر ایک نیا عالمی ریکارڈ بھی قائم کیا۔ 2010ءمیں کوانگزہو، چین میں منعقد ہونے والے ایشین گیمز کے مقابلوں میں انہوں نے لانگ جمپ میں طلائی اور 100میٹر کی دوڑ میں کانسی کا تمغہ جیتا۔ 2006میں انہوں نے کوالالمپور میں منعقد ہونے والے FESPICگیمز میں لانگ جمپ ایونٹ میں طلائی تمغہ حاصل کیا۔ 2016ء کے ریو اولمپکس میں حیدر علی نے لانگ جمپ کیٹیگری میں کانسی کا تمغہ جیتا اور یہ واحد تمغہ تھا جو اس عالمی ٹورنامنٹ میں جیتا گیا تھا۔

## صدف صدیقی

صدف صدیقی نے پاکستان کی جانب سے کئی بین الاقوامی ٹورنامنٹس میں حصہ لیا۔2008ء کے بیجنگ اولمپکس کے موقع پر انہوں نے خواتین ایتھلیٹکس ٹیم میں پاکستان کی نمائندگی کی اور 100میٹر کی دوڑ میں ساتویں پوزیشن حاصل کی۔2008ء میں قومی ایتھلیٹکس چیمپئن شپ میں حصہ لیا اور بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ 2010ء میں ساؤتھ ایشین گیمز میں انہوں نے نسیم حمید، جویریہ حسن اور نادیہ نذیر کے ساتھ حصہ لیا اور بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا۔ 2010ء میں ان پر چند دیگر خاتون کھلاڑیوں کے ساتھ ڈوپنگ اسکینڈل میں ملوث ہونے کی وجہ سے پابندی عائد کردی گئی۔

## نسیم حمید

نسیم حمید کا شمار پاکستان کی مایہ ناز خاتون ایتھلیٹ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اس کھیل میں اپنے کیریئر کا آغاز اپنے اسکول کی طرف سے چھٹی کلاس سے کیا، بعد میں علاقے کے اسکول اور کالج کے مقابلوں میں حصہ لے کر مقامی سطح پر کامیابی حاصل کی۔2003ء میں پاکستان ریلویز کی ایتھلیٹک ٹیم میں کھیلنے کا کنٹریکٹ سائن کیا۔ 2004ء میں آرمی کے شعبہ کھیل سے وابستہ ہوگئیں جس کے بعد انہیں کورنگی میں آرمی گراؤنڈ اور کھیلوں کی دیگر سہولتوں سے استفادہ کرنے کے مواقع مل گئے۔ وہ2011تک آرمی کی ایتھلیکٹ ٹیم سے وابستہ رہیں۔ 2004ء میں ہونے والی نیشنل چیمپئن شپ میں آرمی کی طرف سے شرکت کی اور ایک طلائی، دو نقرئی اور دو کانسی کے تمغے حاصل کیے۔ 2005ء میں پاکستان ایتھلیٹک فیڈریشن کی جونیئر چیمپئن شپ جیتی اور جونیئر چیمپئن کا اعزاز حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ 4طلائی تمغے بھی جیتے۔ 2005ء میں ساؤتھ ایشین گیمز میں جونیئر ایتھلیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔ 2006ء میں پاکستان اسٹیل ملز میں منعقد ہونے والی ڈے اینڈ نائٹ قومی چیمپئن شپ میں طلائی تمغہ حاصل کیا۔ 2005ء میں ایران میں ہونے والے اسلامک گیمز میں پاکستان آرمی کی نمائندگی کی اور 60میٹر کی دوڑ میں ریکارڈ قائم کیا جو اب تک برقرار ہے۔ 2012ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک قومی چیمپئن شپ کے مقابلوں میں ہر سال حصہ لیا اور پہلی و دوسری پوزیشن حاصل کرتی رہیں۔ جب پاکستان ایتھلیٹک فیڈریشن نے 2010ء میں ڈھاکا میں ہونے والے سیف گیمز کے لیے خواتین کھلاڑیوں کا انتخاب کیا تو ان کی نظر آرمی کی ایتھلیٹ اور ویمن قومی چیمپئن، نسیم حمید پر بھی پڑی، اور انہیں ساؤتھ ایشین گیمز کے لیے خواتین ایتھلیٹس کے دستے میں شامل کرلیا گیا۔ سیف گیمز میں ان کی کارکردگی بے مثال رہی اور انہوں نے 100میٹر کی دوڑ جیت کر نہ صرف طلائی تمغہ حاصل کیا بلکہ انہیں ایشین ایتھلیٹکس ایسوسی ایشن کی جانب سے ''اسپرنٹر کوئین آف ایشیاء'' کا خطاب بھی دیا گیا۔ پاکستان واپسی پر اس وقت کے صدر سید آصف علی زرداری نے ان سے ایوان صدر میں ملاقات کی، اس موقع پر انہوں نے نسیم حمید کو'' پاکستان کے کھیلوں کی سفیر'' کی حیثیت سے تعیناتی ، دس لاکھ روپے نقد انعام اورکراچی میں ڈیفنس کے علاقے میں ایک فلیٹ دینے کا بھی اعلان کیا جب کہ اس وقت کے وزیر اعظم ، یوسف رضا گیلانی کی طرف سے بھی 10لاکھ روپے کے انعام کا اعلان کیا گیا۔ وہ اس پذیرائی سے اتنی متاثر ہوئیں کہ انہوں نے اپنی نگاہیں 2012ء کے اولمپک گیمز کی طرف مرکوزکردیں۔ صدر پاکستان کے اعلانات میں سے انہیں ''طلائی تمغے '' کے عوض دس لاکھ روپے تو ادا کردیئے گئے لیکن صدر اور وزیر اعظم کی جانب سے کیے جانے والے دیگر اعلانات بیوروکریسی کی تنگ نظری کا شکار ہوگئے، نہ توان کی کھیلوں کے سفیر کی حیثیت سے تعیناتی کا پروانہ جاری کیا گیااور نہ ہی نقد انعام اور رہائشی فلیٹ ملا۔2012ء میں پشاور میں منعقدہونے والے قومی کھیلوں میں انہوں نے 100میٹر کی دوڑ جیت کر طلائی تمغہ حاصل کیا، اسی سال انہوں نے اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہ صرف ایتھلیٹک کے کھیل بلکہ آرمی کی ٹیم سے بھی ریٹائرمنٹ کا اعلان کردیا۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ ایتھلیٹ، اندرون و بیرون ملک بے شمار تمغے اور اعزازات جیتنے والی نسیم حمید کو اسپرنٹر کوئین کی حیثیت سے ملنے والی شہرت کے باعث کھیلوں کی سرپرستی کرنے والی مخیر شخصیات سے اتنا مالی تعاون حاصل ہوگیا کہ انہوں نے اپنے علاقے میں غریب بچوں کی ایتھلیٹک و دیگر کھیلوں میں تربیت کے لیے نسیم حمید اکیڈمی کے نام سے ادارہ قائم کیا ہے اور ایک رفاہی ادارے میں معذوروں کے ایتھلیٹک کوچ کے فرائض انجام دینے کے علاوہ کھیلوں کے ایونٹس بھی آرگنائز کرتی ہیں جب کہ ایک ویلفیئر فاؤنڈیشن کی جانب سے 2018میں ''اسٹریٹ چلڈرن ورلڈ کپ'' کے لیے کھلاڑیوں کو تربیت دے رہی ہیں۔

§§§

# سائیکلنگ

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

''سائیکلنگ ''واحدکھیل ہے جس کی ابتداء ''سفری ضرورتوں'' سے ہوئی ، جوبعد ازاں ایک مقبول عام کھیل بن گیا اور آج یہ دنیا کے پانچوں براعظموں میں کھیلا جاتا ہے۔ سائیکلنگ کے کھیل کی ابتدا کیسےہوئی ؟اس کے لیےپہلے سائیکل کی ایجاد، اس کے استعمال اور بعد ازاں کھیل کی حیثیت اختیار کرنے تک کے مفصل احوال کا علم ضروری ہے۔ پہیے کی ایجاد ہزاروں سال قبل مسیح میں ہوئی لیکن اس کا استعمال 19ویں صدی میں اس وقت سے ہوا جب جرمنی میں سائیکل کی ایجاد ہوئی ۔سب سے پہلے فرانس کے ڈی سیوراک نے 1690 میں دو پہیوں کو ایک ڈنڈے سے جوڑ کر سائیکل بنائی تھی، اس کا نام انہوں نے ''ہابی ہارس'' رکھا،لیکن یہ ایجاد ایک صدی تک خام شکل میں رہی ۔1817 ء میں جرمنی کے شہر بیڈن کے گرانڈ ڈیو ک کے ملازم ، وون کارل ڈرائسن نے انسانی قوت سے چلنے والی ''ڈینڈی ہارس''جیسی ہیئت کی بائسیکل بنائی، جو 1818ء میں فرانس میں رجسٹر ہوئی ۔ ڈرائسن کی اصطلاح کے مطابق اسے ''لاف مشین'' یا دوڑنے والی مشین کا نام دیا گیا۔ابتدا میں ڈرائسن جب اپنی ایجاد کی ہوئی سائیکل پر بیٹھ کر جرمنی کی سڑکوں پر نکلے تولوگ ان کی عجیب و غریب سواری کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ ڈرائسن اسے پیر وں کی قوت سے ڈھکیلتے ہوئے چلا رہے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ڈینڈی ہارس نامی سائیکل، دو پہیوں کو لکڑی یا اسٹیل کے ڈھانچے پر جوڑ کر بغیر چین اور پیڈل کے گھوڑا گاڑی کی شکل میں بنائی تھی، جسے دونوں پیر زمین پر رکھ کرپیدل چلنے یا دوڑنے کے انداز میں جسمانی قوت کی مدد سے چلانا پڑتا تھا ۔ اگلے پہیے کوایک رسی سے باندھ کر گھوڑے کی باگ کی طرح اسٹیرنگ کی جگہ رکھا گیا تھا جسے سوار موڑنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ 1819ء تک برطانیہ اور فرانس کے کئی سائیکل ساز اداروں نے ڈینڈی ہارس سائیکل کی نقل تیار کی جس میں لندن کا سائیکل ساز ، ڈینس جانسن قابل ذکر ہے، جس نے لکڑی کے خم دار فریم اور بڑے قطر کے پہیے جوڑ کر بھی طرز کی سائیکل بنائی۔ سائیکل کی ایجاد سے قبل لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ یا ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لیے گھوڑے پر سفر کرتے تھے ۔جب سائیکل کا استعمال بڑھنے لگا تو اس میں نت نئی جدتیں پیدا کی گئیں ۔ 1838 میں اسکاٹ لینڈ کے میک ملن نے اس کے پرزوںمیںتبدیلی کی اور تقریبا 3 سال کی عرق ریزی کے بعد اس کو چین اورپیڈل سے چلنے والی سائیکل بنایا گیا ۔ اس وقت سائیکل کو روکنے کیلئے اس میں بریک نہیں لگے ہوئے تھے اور پیروں سے ہی سائیکل کو روکا جاتا تھا، جو بعض اوقات خطرناک بھی ہوتا تھا، اس لیے اسٹیر کرنے کے لیے گھوڑے کی باگ کی جگہ ہینڈل اور اگلے ، پچھلے پہیے کے ساتھ بریکیں لگائی گئیں، جن کا نظام ہینڈل کے ساتھ رکھا گیا۔ 1879ء میں ہنری جان لاسن نے اسے عجیب و غریب ہیئت دی، اس کا اگلا پہیہ خاصے بڑے قطر کا تھا جب کہ پچھلا چھوٹا رکھا گیا، لوگوں نے اس کا نام ''مگرمچھ'' رکھ دیا، اسے فروخت کے لیے مارکیٹ میں پیش کیا گیا لیکن مذکورہ ایجاد کو عوامی پذیرائی نہ مل سکی۔ 1885ء میں جان کمپ اسٹارلے نے اسے محفوظ شکل میں تیار کیا جو کامیاب ثابت ہوا ، اس کا نیا نام ''روور'' ر کھا گیا،اس کے اگلے پہیے کو لوہے کے دو چھٹوں کے ساتھ ہینڈل سے منسلک کیا گیا، دونوں پہیے یکساں سائز کے لگائے گئے، لیکن اس وقت تک اس میں لوہے کے پہیے لگائے جاتے تھے، جس کی وجہ سے سفر زیادہ تر تکلیف دہ ہوتا تھا۔ جان ڈنلپ نے اس صعوبت کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹائر اور ٹیوب تیار کیے، جنہیں لوہے کے پہیے پر چڑھایا گیاجس کے بعد یہ ہموار طریقے سے دوڑنے لگی اور اس پر سفرپہلے کی نسبت زیادہ آرام دہ ہوگیا۔ بیسویں صدی میں یہ سواری پوری دنیا میں ''اسٹیٹس سمبل'' سمجھی جاتی تھی، سرکاری افسران، پولیس اہل کار، فوجی حکام، ڈاکیے ،امراءاور عام لوگ اس پر سفر کرتے ہوئے فخر کرتے تھے۔ہندوستان میںیہ سواری 18ویں صدی کے آخری عشرے میں متعارف ہوئی جس کے بعد برصغیر کے تمام علاقوں میں مقبول ہوتی گئی۔

جب سائیکل کا استعمال بڑھتا گیا توسفر کے ساتھ ساتھ، مقامی طورپر اس کی ریسوں کا انعقاد بھی ہونے لگا۔1868ء میں سرکاری سطح پر پہلی مرتبہ اسے کھیل کا درجہ دیا گیا اور فرانس میں مختصر فاصلے کی سائیکل ریس کا پہلی مرتبہ انعقاد ہوا ،جو پیرس کے نزدیک فوارے اور سینٹ کلاؤڈ پارک کے داخلی دروازے تک 1.200میٹر کے فاصلے تک محیط رہی، یہ ریس پیرس میں مقیم 18سالہ برطانوی نوجوان جیمز مورے نے جیتی۔ اس ریس کی کامیابی اور عوام میں مقبولیت کے بعد فرانسیسی حکومت کی جانب سے 1869ء میں ایک شہر سے دوسرے شہر تک طویل فاصلے کی ریس منعقد ہوئی جو پیرس سے شروع ہوکر 135کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے ''رائین '' شہر میں اختتام پذیر ہوئی۔ اس کا دورانیہ 10گھنٹے 25منٹ تھا جس میں پہاڑی چڑھائی کے کچے راستے پر پیدل سفر بھی شامل تھا، اس کا فاتح بھی جیمز مورے رہا۔چند سالوں میں پورے براعظم یورپ میں روڈ ریس کو مقبولیت حاصل ہونے لگی، جب کہ برطانیہ میں سڑکوں کی خستہ حالت اور ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے ٹریک یا ٹائم ٹرائل سائیکل ریس متعارف کرائی گئی۔ امریکا میں 1878ء میں بوسٹن کے مقام پر پہلی مرتبہ سائیکل ریس کا انعقاد ہوا، جب کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس میں ابتدائی ریسوں کا انعقاد ٹریکس پر ہوا اور 1890ء میں تمام بڑے شہروں میں سیمنٹ یا لکڑی کی مدد سے ٹریکس بنائے گئے۔ اسی سال وہاں 6روزہ نان اسٹاپ ریس کے مقابلے ہوئے، جس میں دنیا بھر کے سائیکل سواروں نے حصہ لیا۔ ریس کی انعامی رقم10ہزار امریکی ڈالر رکھی گئی تھی۔ اسی سال اسے باقاعدہ طورپر ایک کھیل کی حیثیت دی گئی۔1899ء میں اس کے قواعد میں تبدیلی کرکے ہر ٹیم ایک کی بجائے دو سائیکلسٹس پر مشتمل کردی گئی۔ 1899ء کے بعد امریکا میں کسی طویل دورانیے کی ریس کا انعقاد نہ ہوسکا لیکن سائیکل ریس کی یہ شکل اٹلی فرانس اور جرمنی میں مقبول ہوگئی اوروہاں باقاعدگی سے اس کا انعقاد ہونے لگا۔ یورپ میں اس کھیل میں نت نئی جدتیں متعارف کرائی گئیں، سڑکوں کی مرمت کرکے وہاں ایک روزہ ریسوں کا انعقاد ہونے لگا، جس کی ابتدا سب سے پہلے فرانس اور بلجیم سے کی گئی۔ اس سلسلے کی پہلی ریس پیرس سے ''راؤ بیکس'' تک منعقد کی گئی، جس کے بعد اس کا انعقاد ہالینڈ، اٹلی اور اسپین میں بھی کیا جانے لگا۔ سائیکلنگ کے کھیل کو دو درجات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ٹریک اور روڈ سائیکلنگ۔ ٹریک سائیکل ریس کا انعقاد خصوصی طور سے بنائے جانے والے 250میٹر طویل ویلو ڈرم میں ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں روڈ سائیکل ریس کا انعقاد عام سڑک پر ہی خالص فطری ماحول میں ہوتا ، جس میں ریس کے کھلاڑیوں کے ساتھ ساتھ ٹریفک کی روانی بھی جاری رہتی ہے۔

1903ء میں 21روز ہ ''ٹور ڈی فرانس چیمپئن شپ''سائیکل ریس کا آغاز ہوا، اس کے بعد سے یہ چیمپئن شپ ہر سال تواتر کے ساتھ ہوتی ہے، صرف اول اور دوئم عالمی جنگوں کے دوران دس سال کا تعطل رہا۔ ٹور ڈی فرانس کا انعقادجولائی میں ہوتا ہے،جب کہ اس سے قبل مئی اور جون میں ''دی گیروڈی اطالیہ'' نامی ریس کا اہتمام ہوتا ہے۔ ستمبر اسپین کی'' ووئلٹاسائیکل ریس'' اور اکتوبر میں عالمی چیمپئن شپ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ان ریسوں میں جیتنے والے سائیکلسٹس کو خاصی بڑی رقم انعام میں دی جاتی ہے، جب کہ صرف ''ٹور ڈی فرانس چیمپئن شپ'' کی انعامی رقم ڈھائی ملین ڈالر ہے۔ یورپ سے نکل کر یہ کھیل آسٹریلیا اور ملائیشیا میں بھی معروف ہوا۔ فروری سے اکتوبر تک براعظم یورپ اور امریکا میں سائیکلنگ سیزن کہلاتاہے، جب کہ نومبر، دسمبر کے درمیان ایشیاء میں اس کا اختتام ہوتا ہے۔ 1899ء سے 1980ء تک امریکا میں کسی بھی قسم

کی سائیکل ریس کا انعقاد نہیں ہوسکا، البتہ مقامی سطح پر یہ کھیل وہاں مقبول رہا اور اس میں کئی اچھے کھلاڑی ابھر کر منظر عام پر آئے۔ 1984ء میں لاس اینجیلس میں منعقد ہونے والے اولمپک گیمز میں اسے بھی بہ طور کھیل شامل کیا اور امریکی سائیکلسٹس نے حیران کن طور پر اس میں تمغے جیتے۔

برطانیہ میں اس کھیل کا آغاز 20ویں صدی میں ہوا، وہاں پروفیشنل اور ایمیچر سائیکلنگ کو مقبولیت حاصل ہوئی، ''ملک ریس'' اور ''پروٹور ریس'' کا اہتمام کیاگیا۔ آسٹریلیا میں ''ٹور ڈاؤن''، ملائیشیا میں ''لانگ کاوی''، اور'' جاپانی کپ'' کے دوران شاہراہوں پر لکیریں ڈال کر ریس کے لیےعلیحدہ سے ٹریک بنادیا جاتا ہے۔ ان ممالک میں منعقدہ سائیکل ریس یورپ اور امریکا کی پروفیشنل ٹیموں کے لیے پُرکشش ہیں۔ ایشیاء کے کئی دیگر ممالک میں بھی سائیکل ریسوں کا انعقاد کیا جاتا ہے، جن میں ایشین چیمپئن شپ اور ساؤتھ ایشین چیمپئن شپ قابل ذکر ہیں، جن میں صرف ایشین ٹیمیں ہی حصہ لیتی ہیں۔ مردوں کی روڈ اور ٹریک سائیکل ریس تو1896ء میں اولمپکس گیمز کا حصہ بنیں لیکن 1984ء میں خواتین کی پہلی سائیکل ریس اور 1988ء میں خواتین ٹریک ریس کو اولمپک گیمز میں شامل کیا گیا۔ 1996ء میں اٹلانٹا میں اولمپکس گیمز کے موقع پر خواتین کی پروفیشنل ٹیموں کو یس اور ٹریل مقابلوں میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی۔

بھارت میں سائیکلنگ کے کھیل کا آغاز 1938ء میں ہوا، سائیکلنگ فیڈریشن آف انڈیا کے نام سے ایک قومی تنظیم تشکیل دی گئی جو ملکی سطح پر اس کے مقابلوں کا انعقاد اور نگرانی کرتی ہے اس کے علاوہ ہر صوبے اور ریاست میں مقامی تنظیمیں موجود ہیں۔ بھارت میں ہر سال ماؤنٹین بائیکنگ ریس کا باقاعدگی سے انعقاد کیا جاتا ہےجس میں بھارت کی مقامی ٹیموں کے علاوہ بین الاقوامی کھلاڑی بھی حصہ لیتے ہیں۔ گزشتہ سال سکم کی ریاست کی جانب سے سب سے بڑی سائیکل متعارف کرائی گئی جس کی رقم جنوبی ایشیاء کے ملکوں کی بہ نسبت سب سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ بھارت میں ''ٹور آف نیلگریس'' کے نام سے 100 کلومیٹر سائیکل ریس کا انعقاد کیا جاتا ہے، لیکن یہ قطعی طور پر غیر تجارتی بنیادوں پر منعقد کی جاتی ہے۔ ہر سال فروری میں نیشنل روڈسائیکلنگ چیمپئن شپ ہوتی ہے جس میں بھارت کے مختلف اداروں اور شہروں سے تعلق رکھنے والی 25ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ گزشتہ سال بھارت کی جونیئر سائیکلنگ ٹیم، عالمی جونیئر چیمپئن شپ جیت کر بین الاقوامی تنظیم یونین آف سائیکلسٹس انٹرنیشنل کی عالمی درجہ بندی میں پہلے نمبر پر آئی، چند سال قبل یہی ٹیم 149ویں نمبر پر تھی۔

پاکستان میں یہ کھیل حکومت کی عدم توجہی اور کھیلوں کی سیاست کی وجہ سے انحطاط کا شکار ہے۔ قومی کھلاڑی انفرادی طور پر کارنامے انجام دیتے رہتے ہیں لیکن حکومت کی طرف سے نہ تو انہیں پذیرائی ملتی ہے اور نہ ہی سرپرستی حاصل ہے۔ پاکستان میں سائیکلنگ کے کھیل کا آغاز، قیام پاکستان کے بعدکے فوری بعد ہوگیا تھا، بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح ملک میں کھیلوں کے فروغ میں خصوصی دل چسپی رکھتے تھے۔ 1947ءمیں پشاور میں سائیکلنگ کی مجلس منتظمین، پاکستان سائیکلنگ فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا، جس کے پہلے صدر ، قائد اعظم تھے، واپڈا اور آرمی کی چار جب کہ چاروں صوبوں اور اسلام آباد کی سائیکل ٹیمیں باقاعدگی سے قومی ایونٹ میں حصہ لیتی ہیں۔سائیکلنگ کی مذکورہ قومی تنظیم کا پاکستان اسپورٹس بورڈ، پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن اور ایشین سائیکلنگ کنفیڈریشن کے ساتھ الحاق ہے، جب کہ عالمی تنظیم ،یونین آف سائیکلسٹس انٹرنیشنل سے منظور شدہ ہے۔پی سی ایف میں چاروں صوبائی ایسوسی ایشنز کے علاوہ پاکستان آرمی، سوئی سدرن گیس، واپڈا اور اسلام آباد سائیکلنگ ایسوسی ایشن بھی شامل ہیں۔ 1948ء میں کراچی میں پہلے پاکستان اولمپکس گیمز کا انعقادہوا، جس میں قومی سائیکلنگ چیمپئن شپ کے ٹورنامنٹس بھی ہوئے۔ ریس کا افتتاح بانی پاکستان نے کیا۔ پی سی ایف کے زیر اہتمام ہردو سال بعد ٹور ڈی پاکستان انٹرنیشنل سائیکل ریس کا انعقاد ہوتا ہے اس میں150ملکی و بین الاقوامی سائیکلسٹ حصہ لیتے ہیں ۔ پہلے اس کا آغاز کراچی سے ہوتا تھا لیکن اب اس کا دائرہ کار بلوچستان تک بڑھا دیا گیاہے ۔ یہ ریس دنیا کی سب سے بڑی سائیکل ریس ہوتی ہے جو بلوچستان سے شروع ہوکر1648کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے پشاور میں اختتام پذیر ہوتی ہے۔ اس دوران گیارہ مقامات پر کھلاڑیوں کوآرام کرنے کے لیے ٹھہرایا جاتا ہے۔پاکستان سائیکلنگ فیڈریشن کا دوسرا بڑا ایونٹ ''ٹور دی گلیات نیشنل روڈ سائیکل ریس '' کے نام سے خیبر پختون خوا سائیکلنگ ایسوسی ایشن اور ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن خیبر پختون خوا کے اشتراک سے کیا جاتاہے ۔ اس کا انعقاد ،دو مرحلوں میں ہوتا ہے، ریس کے پہلےمرحلے کا آغازاسلام آباد سے ایبٹ آباد تک ہوتا ہے، وہاں سے دوسرے مرحلے میں شروع ہونے والی ریس 8200فٹ کی بلندی پر واقع نتھیا گلی تک جاتی ہے، جہاں اختتامی تقریب منعقد ہوتی ہے جس میں جیتنے والے کھلاڑیوں میں انعامات و اعزازت تقسیم کیے جاتے ہیں۔پاکستان میں1960سے 70کی دہائی تک اس کھیل کو سرکاری سرپرستی حاصل رہی، صدر اور وزرائے اعظم کی جانب سے سائیکلسٹوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، اس دور میں پاکستانی کھلاڑیوں نے اولمپکس سمیت دیگر بین الاقوامی مقابلوں میں بھی حصہ لیا لیکن 1970ء کے بعد اس کھیل کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ ملک کے لیے کارہائے نمایاں انجام دینے والے کئی بین الاقوامی سائیکلسٹس انتہائی کس مپرسی کے عالم میں زندگی گزار رہے ہیں۔1960ء اور 1964ء میں پاکستانی سائیکلسٹ محمد عاشق نے اولمپکس مقابلوں میں اپنے وطن کی نمائندگی تھی۔ اپنے کیریئر کے دوران ملکی و بین الاقوامی مقابلوں میں 70سے زائد سونے، چاندی اور کانسی کے تمغے حاصل کیے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں چار مرتبہ قومی ہیرو کے ایوارڈ سے نوازا گیا لیکن ایک ریس کے دوران زخمی ہونے کے بعد ان کی کارکردگی متاثرہوئی ،جسے جواز بنا کرمحکمہ ریلوے کی طرف سے انہیں ملازمت سےفارغ کردیا گیا۔ بے روزگاری کی وجہ سے ان کی ساری جمع پونجی ختم ہوگئی، گھر اور دیگر اثاثے فروخت ہوگئے، آج کل اپنے اہل خانہ کو فاقہ کشی سے بچانے کےلیے رکشہ چلانے پر مجبور ہیں۔موجود دور میں اس کھیل کے لیے سہولتوں کا فقدان ہے، صوبائی ایسوسی ایشنز اپنے طور سے سائیکل دوڑ کا انعقاد کرتی ہیں۔ ٹریک سائیکل ریس کے انعقاد کے لیے پورے ملک میں 1952ء میں واحد ویلو ڈرم تعمیر ہوا تھا جو خستہ حالی کا شکار ہوکر ریس کے قابل نہیں رہا۔ ملک میں سائیکل کےبے شمار باصلاحیت کھلاڑی موجود ہیں، ان میں سے کئی سائیکلسٹ ناکافی سہولتوں کے باوجود عزم و ہمت اور حوصلے کی بہترین مثال ہیں، جو کوئٹہ سے پشاور تک ٹور ڈی پاکستان سائیکل ریس میں حصہ لے کر کوئٹہ سے پشاور تک سائیکل دوڑاتے ہوئے جاتے ہیں، جب کہ ٹور ڈی گلیات سائیکل ریس میں پہاڑی بلندیوں پر سائیکل چلا کر 8200فٹ بلندی پر چڑھنا انتہائی جوکھوں کا کام ہے، لیکن پاکستانی سائیکلسٹس یہ کارنامہ ہر سال انجام دیتے ہیں، جولائی 2016ء میںپاکستان کی خاتون سائیکلسٹ ثمر خان نے اسکردو میں سطح سمندر سے 13500فٹ کی بلندی پر واقع بیافو گلیشئر پر سائیکل چلا کر نیاعالمی ریکارڈ قائم کیا جب کہ انہوں نے اسلام آباد سے بیافو گلیشیئر تک سائیکلنگ کا بھی ریکارڈ بنا ڈالا۔وہ اس سے قبل سائیکل پر خنجراب تک کا سفر کرنے کا کارنامہ انجام دے چکی ہیں۔ 1999ء میں ہونے والی سارک سائیکلنگ چیمپئن شپ میں ہارون رشید اور دل شیر علی نے بالترتیب طلائی اور نقرئی تمغہ حاصل کیا تھا، یہ کسی بین الاقوامی سائیکل ریس میں پہلا چیمپئن شپ اعزاز تھا جو مذکورہ کھلاڑیوں نے پاکستان کو دلوایا۔

§§§

# فٹ بال کے فکس میچ

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

کرکٹ میں سٹے بازی، میچ و اسپاٹ فکسنگ کے اسکینڈلز تو اکثر و بیشتر منظر عام پر آتے رہتے ہیں، جن میں کھلاڑیوں کو سزاؤں کے علاوہ پابندیوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے، اسکینڈلز کی جب ذرائع ابلاغ پر گونج سنائی دیتی ہےتو ساری دنیا کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوجاتی ہے ۔ کرکٹ کے کھیل کے علاوہ ٹینس، بیس بال اور دیگر کھیلوں میں بھی سٹے بازی عروج پر رہتی ہے اور اکثرکھلاڑی میچ و اسپاٹ فکسنگ اسکینڈلز میں ملوث پائے جاتے ہیں لیکن اسکینڈلز تہلکہ مچانے کے باوجود لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ کرکٹ کے بعد میچ فکسنگ کے سب سے زیادہ واقعات فٹ بال میچوں کے دوران رونما ہوئے اور موازنہ کیا جائے تو ان کی شرح کرکٹ کے فکسنگ اسکینڈلز سے بہت زیادہ ہے۔ فٹ بال میں میچ فکسنگ کی تاریخ بہت قدیم ہے، 1904-05میں میچ فکسنگ کا پہلا اسکینڈل منظر عام پر آیا۔ آسٹن ولا اور مانچسٹر سٹی کے درمیان فٹ بال میچوں کا انعقاد ہوا جن میں دونوں ٹیموں نے بدترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ چار ماہ بعد آسٹن ولا کے کپتان ایلس لیک ، فٹ بال ایسوسی ایشن کے سامنے پیش ہوئے اور مخالف ٹیم کے کپتان ،میریڈتھ پر الزام عائد کیا کہ انہوں میچ ہارنے کے لیے انہیں 10پونڈ کی پیش کش کی تھی۔بعد ازاں فٹ بال ایسوسی ایشن نے میریڈتھ کے کھیلنے پر دو سال کی پابندی عائد کردی تھی۔ 1915ء میں لیورپول اور مانچسٹر یونائیٹڈ کے درمیان ہونے والا میچ بھی فکس ثابت ہوا۔ اس میچ میں مانچسٹر یونائیٹڈ نے صفر کے مقابلے میں دو گول سے فتح حاصل کی تھی۔ میچ میں دونوں ٹیموں کے سات کھلاڑی اس جرم کے مرتکب پائے گئے تھے، جن پر فٹ بال ایسوسی ایشن کی طرف سے تاحیات پابندی عائد کردی گئی۔1964میں برطانیہ میں اس کھیل میں اسپاٹ فکسنگ کا سب سے بڑا اسکینڈل منظر عام پر آیا، جس میں 1960ء میں لیگ فٹ بال میچ کے دوران کئی کھلاڑی ملوث پائے گئے تھے، جنہیں پابندی سمیت قید و بند کی سزائیں بھی دی گئیں۔

1980ء میں اٹلی کے ایک اخبار نے میچ فکسنگ کے ایک اور اسکینڈل کا انکشاف کیا جس میں دو رومن دکانداروں'' الویرو اور ٹرنکا'' کے حوالے سے بتایا گیا کہ، اٹلی کے کچھ فٹ بالر جن میں اے سی میلان اور لازیوٹیم کے کھلاڑی شامل ہیں، بھاری رقومات لے کر میچ فروخت کرتے ہیں۔ تحقیقات کے نتیجے میں ریفریز سمیت اٹلی کی عالمی کپ کی ٹیم کے گول کیپر انریکوالبرٹوسی پوَلو اور میلان ٹیم کے صدر فلیک کولمبو پر تاحیات پابندی عائد کردی گئی۔فروری 1999ء میں ملائیشیاء سے تعلق رکھنے والے بکیز کا سینڈیکیٹ پکڑا گیا، جو چارلٹن اتھلیٹکس گراؤنڈ میں ایف اے پریمئیر لیگ کے میچوں کے دوران ریموٹ کنٹرول ڈیوائس کے ذریعے فلڈ لائٹس کو تباہ کرنے میں ملوث تھا، جب کہ ان کے ساتھ اٹالین فٹ بال ایسوسی ایشن کا ایک سکیورٹی افسر بھی شامل تھا، جب ان کے خلاف تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ مذکورہ گروہ کے ارکان نومبر 1997ء میں ''ویسٹ ہیمر گراؤنڈ'' اور اس کے ایک ماہ بعد کرسٹل پیلس گراؤنڈ میں ایک میچ کے دوران بھی فلڈ لائٹس بند کرکے میچ خراب کرنے میں ملوث تھے۔ 2000ء میں اٹلی کے آٹھ کھلاڑی میچ فکسنگ میں ملوث پائے گئے۔ ان میں سے تین کھلاڑی اٹلانٹا اے سائیڈ اور 5کھلاڑی قسٹوئسی بی سائیڈ کے طرف سے کھیل رہے تھے۔ 2004 ء میں پرتگالی پولیس نے ''لیتیٹو ڈوریڈو'' کے نام سے ایک آپریشن کرکے میچ فکسنگ میں ملوث کئی فٹ بال کلبوں کے صدور اور نمایاں کھلاڑیوں کو گرفتار کرلیا۔ جون2014میں جنوبی افریقہ میں فٹ بال کے 19 ریفریز، فٹ بال کلبوں کے حکام، میچ کمشنر اور جنوبی افریقن فٹ بال ایسوسی ایشن کے اعلی عہدیداروں سمیت 31افراد کو میچ اور اسپاٹ فکسنگ کے الزامات کے تحت گرفتار کیاگیا۔2005ء میں جرمنی میں ''بنڈسلیگا اسکینڈل'' منظر عام پر آیا۔ جنوری 2005ء میں جرمن فٹ بال ایسوسی ایشن اور جرمن پراسیکیوٹرز نے فٹ بال ریفری رابرٹ ہوئزر کے خلاف علیحدہ علیحدہ تحقیقات کی گئیں ،جن میں انکشاف ہوا کہ وہ جرمن کپ سمیت کئی دیگر مقابلوں میں اسپاٹ فکسنگ کے جرائم میں ملوث تھے۔ تحقیقاتی رپورٹوں میں بتایا گیا کہ وہ کروشیا کے سٹے بازوں کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے ، انہوں نے اپنے میچ فکسنگ کے نیٹ ورک میں کئی کھلاڑیوں کو شامل کیا ہوا تھا۔ تحقیقات کے نتیجے میں اس کیس میں پہلی گرفتاری 28جنوری کو برلن میں عمل میں آئی جب کہ ہوئزر کو 12فروری کو گرفتار کیا گیا۔ اقرار جرم کے بعد ہوئزر پر تاحیات پابندی کے علاوہ دوسال پانچ ماہ قید کی سزا بھی دی گئی۔

ستمبر 2005ء میں برازیل میں شائع ہونے والے ایک جریدے کی رپورٹ میں ایک فٹ بال میچ کے دوران، میچ فکسنگ اسکینڈل کا انکشاف ہوا، جس میں دو ریفری ایڈلسن پریرا، جن کا تعلق فیفا کے آفیشل ریفری پینل سے تھا اور جوز ڈینلین، رشوت لے کر میچ فکس کرنے کے جرم میں ملوث پائے گئے۔ دونوں ریفریز کے خلاف تحقیقات ہوئیں جس کے بعد ان پر تاحیات پابندی عائد کردی گئی۔2008ء میں ایک اسپورٹس صحافی، ڈکلن ہال کی کتاب ''دی فکس'' میں الزام لگایا گیا کہ 2006ء کے فٹ بال ورلڈ کپ کے دوران گھانااور اٹلی، گھانااور برازیل کے درمیان ہونے والے میچزجب کہ اٹلی اور یوکرائن کے درمیان ہونے والا کوارٹر فائنل فکس تھا، اور سٹے بازوں کا تعلق ایشیاء کے میچ فکسر سینڈیکیٹ سے تھا جنہیں میچ کے فیصلوں کا قبل از وقت علم رہتاتھا۔ اکتوبر 2009ء میں جرمن پولیس نے17 ایسے افراد کو گرفتار کیا جو 9ممالک میں منعقد ہونے والے 200مقابلوں کے دوران میچ فکسنگ میں ملوث پائے گئے تھے۔ ان میں سے12یورپین لیگ اور تین چیمپئنز لیگ کے میچوں میں بھی شامل رہے تھے۔جون 2011ء میں فن لینڈ میں فٹ بال میچز کے دوران میچ فکسنگ کے الزام میں بعض ٹیموں کے خلاف تحقیقات کی گئیں۔ تحقیقاتی ٹیم کے سامنے ''ٹیمپرے یونائیٹڈ ''کی ٹیم نے اعتراف کیا کہ انہوں نے ایک مشہور سٹے باز سے پیسے لے کر میچ فکس کیا تھا۔جولائی 2011ء میں ترکی کی پولیس کی جانب سے فٹ بال میچوں میں میچ و اسپاٹ فکسنگ اسکینڈلز کی وسیع پیمانے پر تحقیقات کی گئیں، جس کی بنیاد پر محکمہ پولیس کے کرائم کنٹرول بیورو نے چیمپئن کلب ،فیز بینس کے چیئرمین، کلب کے عہدیداروں، کھلاڑیوں کے علاوہ دیگر پندرہ صوبوں میں آپریشن کرکے سٹے بازی میں ملوث 60 افراد کو حراست میں لیا گیا ، لیکن کسی ٹیم کے خلاف کوئی بھی کارروائی نہیں کی گئی بلکہ وہ اب بھی ٹرکش فٹ بال لیگ کی جانب سے میچوں میں شرکت کرتی ہیں۔ فکسنگ کے الزام میں 22لبنانی فٹ بالرز کے کھیلنے پر تاحیات پابندی عائد کردی گئی۔ 2013 - میں برطانیہ میں'' بلیک برن ٹیم'' کے فارورڈ ڈی جے کیمبل سمیت 6افراد میچ فکسنگ کے الزامات میں ملوث پائے گئے۔ بلجیم سے تعلق رکھنے والے اینٹی کرپشن ادارے، ''فیڈربیٹ'' کی رپورٹ کے اجراء کے بعد برطانیہ کی نیشنل کرائمزایجنسی نے مذکورہ افراد کو حراست میں لے لیا۔

ہالینڈ میں بھی فٹ بال میچوں میں اسپاٹ و میچ فکسنگ کی صدائیں سنائی دیں،ذرائع ابلاغ میں ان الزامات کی بازگشت کے بعد ملک کی فٹ بال ایسوسی ایشن نے معاملے کی تحقیقات کروانے کا اعلان کیا۔ہالینڈ کے روزنامے ''ڈی ولکسکرانت '' میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں درج تھاکہ، 10-2009 کے سیزن کے دوران دوفٹ بال میچ فکس تھے۔ان میں ایک ٹیم ٹلگرک سے تعلق رکھنے والی '' ولم توے'' تھی جب کہ اس کے مدمقابل ایمسٹرڈیم سے تعلق رکھنے والی ''ایجیکس'' اور روٹرڈیم کی ''فینورد ''تھیں۔مذکورہ رپورٹ کے مطابق میچ فکس کرنے کے لیے رقم سنگاپور سے تعلق رکھنے والے ایک سنڈیکیٹ نے فراہم کی تھی۔اس رپورٹ میں افریقی ملک سیرالیون سے تعلق رکھنے والے'' ولم توے ٹیم'' کے مڈفیلڈر ابراہیم کارگبو کو میچ فکسنگ کا اصل کردار بتایا گیا۔واضح رہے کہ کارگبو کو ایک سال قبل سیرالیون کی قومی ٹیم سے تین دیگر کھلاڑیوں کے ہمراہ معطل کیا گیا تھا۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے2008 میں جنوبی افریقہ کے خلاف ورلڈ کپ کوالیفائر مقابلہ فکس کیا تھا۔2007ء میں مالینڈ کے ایک انگریزی اخبار کے رپورٹر نے خفیہ پلاننگ کے تحت ہالینڈ کے ایک کھلاڑی سے ملاقات کی تھی، جو تیس ہزار پاؤنڈز کی خطیر رقم کے عوض میچ فکس کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ اس پلیئر نے پریمئیر لیگ کے علاوہ

اس سے اگلے سال ورلڈ کپ کے میچوں کو بھی فکس کرنے پر بھی آمادگی ظاہر کی تھی۔اخبار کی رپورٹ کے مطابق میچ فکسرز کا یہ سینڈیکیٹ پورے یورپ میں پھیلا ہوا ہے اور فٹ بال کے زیادہ تر میچز اسی کی ایماء پر فکس ہوتے ہیں۔ ہالینڈ میں میچ فکسنگ کے اسکینڈل کے منظر عام پر آنے کے بعد جرمن شہر بوخم میں یورپی فٹ بال کے نگراں ادارے یوئیفا کے ماہرین اور جرمن استغاثہ Peter Limacher نے ایک نیوز کانفرنس میں کہا کہ اِس اسکینڈل کی نوعیت دیکھ کر یوئیفا کے اراکین شش و پنج میں مبتلا ہیں۔یوئیفا کے حکام کا کہنا ہے کہ، جرمنی میں بھی چیمپئنز لیگ کے تین میچوں کے علاوہ یورپین لیگ کے بارہ میچ فکس کئے جانے سے متعلق انکوائری جاری ہے۔ یہ تمام میچ2007 اور 2008کے درمیان کھیلے گئے تھے۔یوئیفاکے سیکریٹری جنرل گیانی انفینٹن نے اِس معاملے کو ناقابِل برداشت قرار دیا ۔پولیس نے اِس سلسلے میں جرمنی کے علاوہ سوئٹزر لینڈ، برطانیہ اور آسٹریا میں پچاس مختلف مقامات پر چھاپے مارے۔ اِن کارروائیوں میں سترہ افراد کو حراست میں لیا گیا ہے جبکہ بھاری مقدار میں کرنسی اور گرفتار شدگان کی کر لی گئیں۔ اِن میں سے پندرہ افراد کو جرمنی جب کہ دو کو سوئٹزرلینڈ میں گرفتار کیا گیا ہے۔جرمنی میں اس سےچار سال قبل بھی میچ فکسنگ اسکینڈل سامنے آیا تھا۔

اکتوبر 2015ء میں نیپال فٹ بال ٹیم کے کپتان اور ان کی ٹیم کے چار کھلاڑی میچ فکسنگ کے الزام میں گرفتار کئے گئے ۔اس سلسلے میں پولیس ترجمان، سربندرا کھنال نے بتایا کہ کپتان ساگر تھاپا، سندیپ رائے، رتیش تھاپا، بخش سنگھ اور آنجن پر، ملائیشیا اور سنگاپور میں میچ ہارنے کے لئے بک میکر سے رقم وصول کرنے کا الزام ہے۔ان کھلاڑیوں پر ان کے ''بینک اسٹیٹمنٹ'' چیک کرنے کے بعدمقدمات درج کئے گئے جن میں میچ سے پہلے ان کے کھاتوں میں 2008ء کے دوران بھاری رقومات کے اندراجات تھے۔2014ء میں فٹ بال کی عالمی تنظیم ، فیفا کی انضباطی کمیٹی نے نیپال فٹ بال فیڈریشن کے سربراہ اور ایشین فٹ بال کنفیڈریشن کے سابق نائب صدر، قاعدگیوں کے ضمن میں تحقیقات کا آغاز کیا تھا۔

جون 2015میں اسپین کی درجہ اول کی لیگ کھیلنے والے ناہارا کے کلب ۔ اوساسونا کے خلاف میچ فکسنگ اسکینڈل کی تحقیقات کرنے والے کمیشن کے جج نےمذکورہ کلب کو 9 لاکھ یورو کے عوض گزشتہ سیزن میں 3 میچ فکس کرنے کا مرتکب قرار دیا۔ان میں سے ایک میچ میں بارسلونا کےکلب اسپانیول کو میچ برابر کھیلنے کے عوض 250000 یورو کی ادائیگی اور میتیس کلب کو بایادولید کلب سے میچ جیتنے کے عوض 4 لاکھ یورو اور اوساسونا سے ہارنے کے عوض 250000 یورو کی ادائیگی شامل ہے۔ جج نے اوساسونا کلب کے بینک کھاتوں سے 24 لاکھ یوروںنکالنے کی بھی تفتیش کرتے ہوئےاس بات کا سراغ لگانے کی کوشش کی کہ مذکورہ رقم کن مدات میںخرچ کی گئی۔2013 میںیورپی یونین کے اسپیشل پولیس یونٹ یورو پول نے اپنی ایک رپورٹ میںلکھا کہ اس نے 2008ء سے 2011ء کے درمیان380 فٹ بال میچوں کے فِکس ہونے کے شواہد حاصل کیے ہیں۔ ہالینڈ کے شہر ہیگ میں یورو پول کے سربراہ روب وین رائٹ نے ذرائع ابلاغ سے گفتگوکرتے ہوئے الزام لگایاکہ، فٹ بال کے مقابلوں اور اسپاٹ فکسنگ کی پشت پر ایشیا میں قائم ایک منظم نیٹ ورک ملوث ہے۔ ان کے مطابق15 ممالک میں420 افراد میچ فِکسنگ میں ملوث پائے گئے۔2012میںاٹلی کی عدالت نے فٹ بال پریمئر لیگ میں میچ فکسنگ کرنے والے افراد پر ساڑھے باون لاکھ ڈالر کا جرمانہ عائدکیا ۔اطالوی عدالت نےفٹ بال فیڈریشن کی ساکھ تباہ کرنے کے جرم میں 14 افراد پر بھاری جرمانے عائد کیے ہیں۔ اٹالین فٹبال لیگ کے2006 کے سیزن میں میچ فکسنگ میں ملوث افراد میں سابق ریفری پاؤلو برگامو پر ڈیڑھ لاکھ ڈالر اور سابق سلیکٹر پائرلوگی پر دس لاکھ ڈالر کا جرمانہ عائدکیا گیا جب کہ فٹ بال فیڈریشن کے سابق نائب صدر پر 91 لاکھ، 8ہزار ڈالرجرمانہ عائد کیا گیا ۔نومبر2016میں لاؤس سے تعلق رکھنے والےچارفٹ بالر زکو ایشین فٹ بال کنفیڈریشن نے میچ فکسنگ کے الزام میں 60 دن کیلئے معطل کر دیا ۔ کنفیڈریشن کا کہنا تھا کہ ان پر صرف سالیڈریٹی کپ میں میچ فکسنگ کا الزام نہیں ہے بلکہ 2010 سے مختلف میچوں کو فکس کرنے کے الزامات بھی ہیں ۔ فروری 2012ء میں میچ فکسنگ الزامات ثابت ہونے کے بعد زمبابوے کی فٹ بال فیڈریشن نے 80 کھلاڑیوں کو معطل کر دیا۔ان پلیئر ز میں قومی ٹیم کی جانب سے کھیلنے والے کھلاڑی بھی شامل ہیں۔

§§§

# خواتین کا عالمی دن

مصنف: علی احمد

مارچ کی 8 تاریخ خواتین کے عالمی دن کے طور پر منائی جاتی ہے ایک طرف اللہ تعالی نے جنت ماں کے قدموں میں رکھ دی ہے تو دوسری طرف آج بھی ہمارے معاشرے میں عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے عورت کے حقوق پہ بحث کوئی نئی بات نہیں کئی صدیوں سے عورت اپنے حقوق کے حصول کے لیے جہدِ مسلسل میں ہے۔ وہی حقوق جن کی ادائیگی آج سے 14 سو سال پہلے اسلام کر چکا۔ اسلام جس نے عورت کو عزت و مقام دیا۔ ورنہ اسلام کے آغاز سے پہلے عرب میں عورت کو زندہ گاڑ دیا جاتا تھا۔ لڑکی کی پیدائش ایک نحوست سمجھی جاتی تھی۔ عورت کو فساد کی جڑ سمجھا جاتا تھا۔ ہندو معاشرہ جو آج بھی عورت کو مکمل حقوق دینے سے قاصر ہے۔

شوہر کے مرنے کے بعد عورت دوبارہ سے نارمل زندگی گزارنے کا حق نہیں رکھتی۔ عورت کو ''ستی'' جیسی بے بنیاد اور غیر انسانی رسم کے مطابق زندگی گزارنا پڑتی ہے۔مغربی معاشرے کی عورت جو کبھی Feminism کی قائل تھی اب اُس معاشرتی آزادی سے تنگ آتی دکھائی دے رہی ہے۔فرانس جیسے ترقی یافتہ ملک میں عورت کو ووٹ ڈالنے کی آزادی نہیں تھی کچھ سال قبل عورت کو ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہوا۔ عورت جو مغربی معاشرے میں مرد کے شانہ بشانہ معاشی ریس میں چلتی چلتی اب تھک چکی ہے۔ اس معاشرے میں جہاں عورت کو مرد کے برابر کام کرنا پڑتا ہے۔

جہاں زندگی کی ساری سہولیات کے حصول کے لیے انسان دن رات کام تو کرتا ہے مگر پیسے اور کام کی اس دوڑ میں کہیں رشتے اور خاندان بہت دور جا چکے ہیں۔مشرقی معاشرہ جو ایک طرف تو غیرت کے نام پر بہن و بیوی اور بیٹی کا قتل جائز سمجھتا ہے۔ دوسری طرف اسی معاشرے میں کسی کی بھی بیوی، بہن اور بیٹی سڑک و بس سٹاپ اور گلی بازاروں میں چلتی پھرتی خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے۔ اس کم پڑھے لکھے اور غیر ترقی یافتہ معاشرے میں اگر کوئی لڑکی بس کے انتظار میں ''بس سٹاپ'' پہ کھڑی ہو تو ہر عمر کا مرد اُسے لفٹ دینے کیلئے تیار کھڑا ہوتا ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں کسی مرد کو اپنی غیرت اور عزت تو محفوظ چاہیے مگر کسی دوسرے کی عزت انہی سڑکوں پہ رُسوا کی جاتی ہے۔آج اکیسویں صدی کے اس نام نہاد مہذب معاشرے میں عورت کی تعلیم اس کے حقوق اور آزادی پہ بات کرنے والوں نے کیا صحیح معنوں میں عورت کو عزت دینے کی کوشش کی؟عورت کی تعلیم جس کی بات آج مغربی معاشرہ کرتا ہے اس کے بارے میں احکام تو اسلام چودہ سو سال قبل دے چکا ہے۔

نبی کریمؐ کے ارشاد کے مطابق''علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے''ایسا پریکٹیکل مذہب جو صدیوں پہلے ہی عورت کے حقوق متعین کر چکا جو عورت کو تعلیم کا حق دے چکا۔ اُسی مذہب کے پیروکار عورت کو عزت دینے میں اتنے بخیل کیوں؟اسی پاکستان میں جو بنا ہی اسلام کے نام پر تھا آج بھی اس معاشرے میں جسمانی اور ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہیں اسے وراثت میں حصے سے محروم رکھا جاتا ہے تو کہیں غیرت کے نام پہ اس کا خون بہایا جاتا ہے۔دنیا میں ہر چیز کے کچھ منفی اور کچھ مثبت پہلو ہوا کرتے ہیں۔ مرد چاہے مغربی معاشرے کا ہو یا مشرقی معاشرے کا اگر اس کی سوچ مثبت اور تعمیری ہو۔

اگر وہ اخلاقیات کے اعلٰی درجہ پہ ہو تو وہ عورت کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ یہ اُس کی تربیت ہے جو اسے عورت کی عزت کرنا سکھاتی ہے۔ اور مرد کی تربیت ماں کی گود سے شروع ہو کر خاندان کے ماحول سے ہوتی ہوئی معاشرے کے طور طریقوں پہ ختم ہوتی ہے۔مثبت سوچ کے مالک لوگ نہ صرف عورت کو عزت دیتے ہیں بلکہ انہیں خاندان اور معاشرے کا نہایت اہم رُکن کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں وہ اپنی ماں، بیوی اور بہن اور بیٹی ان سارے حوالوں سے عورت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اگر معاشرے کے مثبت پہلوؤں پہ روشنی ڈالتے ہوئے کئی روشن مثالوں کو بیان کریں تو اسی معاشرے کا حصہ ہوتے ہوئے جدوجہدِ آزادی میں سرگرم رہنے والی خاتون ''فاطمہ جناح مادرِ ملت'' کہلائیں۔معاشرے کی فلاح اور رہنمائی کا بیڑا سَر پر اُٹھائے ہوئے دن رات مصروفِ عمل رہنے والی بلقیس ایدھی ایک منفرد اور اعلٰی سوچ رکھنے والے عظیم انسان کی بیوی ہے۔

ادبی دنیا میں ایک اعلٰی مقام رکھنے والی عظیم ادیبہ بانو قدسیہ کو بھی اشفاق احمد جیسے ایک اعلٰی پایئے کے محقق اور مدبر انسان کی معاونت حاصل رہی۔افواجِ پاکستان میں بھرتی ہونے والی خواتین جو اپنی زندگی داؤ پہ لگا کر فرض کی تکمیل کے لیے ہر روز ڈیوٹی پہ موجود ہوتی ہیں۔ انہی میں سے ایک فلائینگ آفیسر مریم مختیار اس وطنِ عزیز کیلئے جان کا نذرانہ پیش کرنے والی باہمت بیٹی کا جنم بھی تو اسی معاشرے میں ہوا تھا۔اٹامک اور نیوکلیئر فزکس میں مہارت رکھنے والی اس قوم کی غیور ''بیٹی'' ڈاکٹر عافیہ صدیقی'' بھی تو کسی باپ کی بیٹی، کسی شوہر کی بیوی اور کسی بیٹے کی ماں ہے۔ کسی تہذیب میں تو مرد عورت کی تعلیم میں روکاوٹ بنا تو کسی جگہ اُسی کی سپورٹ کرنے میں سرِ فہرست رہا۔عورت اس معاشرے کا نہایت اہم جزو ہے۔ جس کے بغیر نہ نسلیں چل سکتی ہیں نا قومیں بن سکتی ہیں۔

عورت کے وجود سے ہی زندگی ہے سوال یہ ہے کہ ''عورت آخر چاہتی کیا ہے؟''عورت عزت چاہتی ہے تحفظ چاہتی ہے۔ عورت تعلیم حاصل کر کے زندگی کی دوڑ میں مرد کے ساتھ چلنا چاہتی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ عورت کا حقیقی مقام سمجھتے ہوئے جو ایک ماں بھی ہے اور ایک بیٹی بھی وہ بیوی ہے اور بہن بھی و معاشرے کی ترقی میں عورت کے کردار کو سمجھا جائے۔ تعلیم عورت کا بنیادی حق ہے۔ پڑھی لکھی ماں ہی پڑھے لکھے معاشرے کو جنم دے سکتی ہے۔عورت کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے معاشرے اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کو روشن بنایا جا سکتا ہے اور ملک کی ترقی اور خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہو سکتا ہے۔

§§§

# صنعتی و معاشی حب

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

سندھ حکومت کی روایتی بے حسی' لاپرواہی وغفلت اوربلدیاتی ودیگر سرکاری اداروں کی مجرمانہ غفلت نے ملک کے معاشی حب کراچی کو گندگی وکچرے کے ڈھیر میں تبدیل کردیا ہے۔ویسے تو پورا شہر کچرا کنڈی کا منظر پیش کررہا ہے لیکن صنعتی زونز میں صحت وصفائی کی صورتحال تشویشناک ہے۔ کورنگی ' سائٹ' بن قاسم' نارتھ کراچی 'سپر ہائی وے کے صنعتی علاقوں میں بلدیاتی اور دیگر سرکاری اداروں کی نااہلی کے باعث سیوریج سسٹم ناکارہ ہوچکا ہے جس کے باعث بیشتر صنعتی علاقوں میں جگہ جگہ گٹر ابلنے سے سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کرکھنڈرات میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ صنعتی علاقوں میں قائم کچرا کنڈیوں کی عدم صفائی کے باعث تعفن پھیل رہا ہے۔ شہر قائد کے تمام صنعتی زونز میں صحت وصفائی کا فقدان اورفراہمی آب معطل ہے۔ وفاق کو تقریباً 70فیصد ریونیو دینے کے باوجود کراچی کے صنعتی زونز تمام بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ طویل بدامنی کے بعد آپریشن کے نتیجے میں امن وامان کی صورتحال میں قدرے بہتری کے باعث تجارتی وصنعتی سرگرمیوں میں بھی قابل ذکر اضافہ ہوا ہے لیکن بنیادی سہولتوں کی عدم فراہمی اورتوانائی بحران کے صنعتی وتجارتی شعبوں پر منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ کئی سالوں سے جاری بدامنی اورتوانائی بحران سے تنگ آکر اپنا سرمایہ بیرون ملک اوراندرون ملک منتقل کرنے والے صنعتکار وتاجرامن وامان کی صورتحال میں بہتری کے بعد واپس کراچی کا رخ کرنے لگے ہیں لیکن بنیادی سہولتوں کی عدم فراہمی اورحکمرانوں کی معیشت کے فروغ کیلئے عدم دلچسپی سے بیشتر صنعتکاروں وتاجر دلبرداشتہ ہیں۔ وفاقی وزیر تجارت انجینئر خرم دستگیر کراچی کے دوروں کے دوران اپنے من پسند وتاجروں کے ساتھ فوٹوسیشن کرانے کے بعد واپس اسلام آباد چلے جاتے ہیں۔ صنعتی اداروں کے مسائل کے حل کیلئے وفاقی اور سندھ حکومت کی پالیسی ایک جیسی ہے۔ صنعتی وپیداواری شعبوں کو بنیادی سہولتوں کی فراہمی اور دیگرمسائل کے حل کیلئے وفاقی وصوبائی حکومت کا رویہ انتہائی غیر سنجیدہ ہے۔ وفاقی وزراء اورصوبائی وزیر صنعت وتجارت کی صنعتی وپیداواری شعبوں کے فروغ کیلئے سرگرمیاں محض فوٹو سیشن تک محدود ہیں۔

بلدیاتی نظام کے خاتمے بعد بنیادی مسائل کے حل کیلئے بلدیاتی اداروں کی ناقص کارکردگی کی سب سے بڑی وجہ سیاسی وسفارشی بنیادوں پر صنعتی ایڈمنسٹریٹرز اورٹاؤن میونسپل آفیسرز کی تعیناتی ہے ۔ صنعتی وتجارتی علاقوں میں تعینات بلدیاتی عملہ صفائی ستھرائی کی بجائے گھر بیٹھے تنخواہیں وصول کررہا ہے۔ کراچی بھر کے بلدیاتی ملازمین اپنی آدھی تنخواہیں ایڈمنسٹریٹرز اور ٹی ایم اوز کو اپنے فرائض ادا نہ کرنے کی مدمیں ادا کرتے ہیں اور آدھی تنخواہوں پر وہ خود گزارہ کرتے ہیں۔ یہی صورتحال واٹر بورڈ کی ہے۔ واٹر بورڈ کے حکام وعملے کی ملی بھگت سے کراچی میں پانی کے کاروبار نے باقاعدہ صنعت کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ غیر قانونی ہائیڈرنٹس کی بھرمار سے صنعتکار اپنے حصے کا پانی بھی خرید کر صنعتیں چلانے پر مجبور ہیں۔ قلت آب' صفائی ستھرائی کے فقدان اورتوانائی بحران کے باعث صنعتی شعبوں کی زبوں حالی میں بتدریج اضافہ ہورہا ہے اوربیشتر صنعتکار اس صورتحال سے شدید پریشانی اورمشکلات سے دوچار ہیں۔

شہر قائد کے صنعتی علاقوں میں بنیادی سہولتوں کی عدم فراہمی کے حوالے سے جہاں وفاقی اورصوبائی حکومتیں ذمہ دار ہیں وہاں فیڈریشن' کراچی چیمبر' کاٹی' نکاٹی' بقاٹی' سائٹ اورسپر ہائی وے آف ٹریڈ اینڈ انڈسٹری اوردیگر تجارتی وصنعتی تنظیمیں بھی برابر کی شریک ہیں۔ کراچی کے صنعتی وتجارتی شعبوں کے مسائل کا حل کبھی بھی ان صنعتی وتجارتی تنظیموں کے عہدیداروں کی اولین ترجیح نہیں رہا۔ فیڈریشن ہویا کراچی چیمبر' یا پھر دیگر صنعتی وتجارتی تنظیموں کے منتخب عہدیدار 'ہمیشہ ان کی ترجیحات موجودہ حکمرانوں اورصوبائی افسران کے اعزاز میں تقریبات کے انعقاد اورفوٹو سیشن تک محدود رہی ہیں۔ تاجروں اورصنعتکاروں کی نمائندگی کے دعویدار تمام لیڈرز کی ہمیشہ سے ایک روایت رہی ہے کہ یہ ایسوسی ایشنز اور اپنے دفاتر میں ہرجانے والے حکمران اور صوبائی افسران کے ساتھ بنی تصاویر ہٹا کرنئے آنے والے حکمرانوں وافسران کے ساتھ فوٹو سیشن کرانے کے بعد ان کی تصاویر آویزاں کرکے اپنے ذاتی مفاد حاصل کرتے ہیں۔ صنعتکار وتاجر نمائندوں کی دوہری ودوغلی پالیسیاں بھی صنعتی وتجارتی شعبے کے مسائل کے حل میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ توانائی بحران اور بنیادی سہولتوں کی عدم فراہمی کے باعث گزشتہ سال برآمدات میں کمی ہوئی ہے۔ برآمدات میں کمی کا سبب پیداواری عمل کا متاثر ہونا ہے۔ یوری یونین کی جانب سے تجارتی مراعاتی اسکیم (جی ایس پی پلس) ملنے کے باوجود مالی سال 2013-14 میں برآمدات25ارب 11کروڑ ڈالرز تک پہنچنے کے بعد تنزلی کی جانب گامزن ہے۔ برآمدات کی ماہانہ اوسط 2ارب ڈالرز سے بھی نیچے آگئی ہے۔ جولائی 2015 کے دوران برآمدات میں 17فیصد کی نمایاں کمی ریکارڈ کی گئی ہے۔ برآمدات کو فروغ دینے کیلئے حکومتی اقدامات پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے اوریہ برآمدی شعبے کی بدترین کارکردگی ہے۔ دوسری جانب حکومت برآمدات کو فروغ دینے کے دعوے کررہی ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ حکومت کی مجوزہ ٹریڈ پالیسی کے تحت تین سال میں برآمدات 50ارب ڈالرز تک پہنچانے کے اعلانات کئے جارہے ہیں اور برآمدات بڑھانے کیلئے کئی ممالک سے ترجیحی اور آزاد تجارتی معاہدوں کیلئے مذاکرات کئے جارہے ہیں۔ حکومت کی جانب سے بارہا یہ دعویٰ کیاجارہا ہے کہ آزاد تجارتی معاہدوں سے پاکستانی تجارت کونقصان پہنچنے کا تاثر غلط ہے لیکن زمینی حقائق حکومتی دعو?ں کے برعکس ہیں۔ ہر گزرتے ماہ کے ساتھ پاکستانی برآمدات کا گراف نیچے کی جانب جارہا ہے۔ پاکستان بیورو شماریات کے مطابق جون 2015کے مقابلے میں جولائی 2015کے دوران برآمدات میں کمی اوردرآمدات میں اضافے کے باعث تجارتی خسارہ بڑھ گیا ہے۔صنعتی شعبوں میں بنیادی سہولتوں کی عدم فراہمی کے باعث پیداواری عمل شدید متاثر ہورہا ہے۔ برآمدات میں کمی سے تجارتی خسارہ تشویشناک حد تک بڑھ رہا ہے۔ صنعتی پیداواری عمل میں سست روی اورملکی برآمدات میں کمی حکمرانوں وصنعتی نمائندوں کیلئے لمحہ فکریہ ہے۔ ملک کے معاشی حب کے صنعتی زونز کو بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے بغیر برآمدات میں اضافے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا ہے۔ برآمدات کا فروغ بیرون ممالک سے آزادانہ تجارتی معاہدے کرنے سے نہیں بلکہ صنعتی پیداوار میں اضافے سے ممکن ہے۔ حکومتی اور صنعتی ایسوسی ایشنز زمینی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے صنعت دوست پالیسی اپنائیں بصورت دیگر معاشی شعبے کی ترقی اوربرآمدات کافروغ ممکن نہیں۔

§§§

# کرپشن کی سماجی وجوہات

مصنف: علی احمد

قومی احتساب بیورو کی کرپشن کیخلاف بیداری شعور مہم کی ڈائریکٹر جنرل عالیہ رشید کا کہنا ہے کہ ہمارے ملک میں سرکاری افسران کی کرپشن کے پیچھے انکے خاندان خصوصاً بیوی بچوں کا سماجی دباؤ بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے جب کسی بھی با اختیار اعلیٰ اور ادنی سرکاری ملازم کو اسکے بیوی بچے یہ بتاتے ہیں کہ انکے ملنے جلنے والوں کے پاس بڑے بڑے بنگلے اور مہنگی پرتعیش گاڑیاں ہیں اور وہ ہر سال بیرون ملک سیرو سپاٹے کیلئے جاتے ہیں۔ دوبئی، لندن اور امریکہ سے شاپنگ کرتے ہیں تو یہ باتیں سن کر وہ سرکاری ملازم ذہنی دباؤ میں آ جاتا ہے اور اپنے خاندان والوں کے سامنے ہیرو بننے کی خاطر سرکاری وسائل کی لوٹ مار شروع کر دیتا ہے اور اپنے اہل خانہ کی ناجائز خواہش پوری کرنے کیلئے کرپشن کی دلدل میں بری طرح پھنس جاتا ہے۔ اگر ہمارے ملک کے سرکاری افسروں کے بیوی بچے ناجائز خواہشوں کو پورا کرنے کیلئے اپنے خاوند اور باپ کا جذباتی استحصال نہ کریں تو اس ملک سے کرپشن 50 فیصد تک کم ہو سکتی ہے۔ عالیہ رشید کی باتوں میں جزوی طور پر صداقت ہے اسی لئے قرآن پاک میں مال اور اولاد کو فتنہ قرار دیا گیا ہے۔ میں نے اعلیٰ ترین سرکاری آفسروں کو اپنے بیوی بچوں کے پرتعیش لائف سٹائل کی خاطر اس ملک کے وسائل کو بے دردی سے لوٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ 20 اور 22 گریڈ کے بے تحاشا افسران کے چار چار بچے لندن امریکہ کی ایسی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں جن کے ایک ایک سمسٹر کی فیس 60 ہزار ڈالرز تک ہے جبکہ والد صاحب حکومت کے انیسویں گریڈ کے ملازم کے طور پر ماہانہ ڈیڑھ لاکھ تنخواہ حاصل کر رہے ہوتے ہیں اور بیرون ملک پڑھنے والے بچوں پر سالانہ 5 کروڑ روپے سے زیادہ خرچ کر رہے ہیں ۔ ایک اندازے کیمطابق اعلیٰ سول اور فوجی افسران جن کے گریڈ 19 سے لے کر 22 تک ہیں۔ 80 فیصد افسران کا شمار اسی کیٹگری میں آتا ہے ریونیو محکمے کا پٹواری، تحصیلدار اور ضلعی انتظامیہ کا چیف افسر، ڈپٹی کمشنر اور کسٹم کا سپرنٹنڈنٹ سے لے کر کلکٹر تک ہر افسر اپنی تنخواہوں اور مراعات کی نسبت 10 گنا زیادہ اخراجات کر رہا ہوتا ہے۔

اس پر مستزاد پنجاب حکومت نے بیورو کریسی کے متوازی سینکڑوں اتھارٹیاں اور کمپنیاں بنائی ہوئی ہیں جن میں تعینات حکمرانوں کے چہیتے تنخواہوں کی مد ہی میں ماہانہ 10 سے 20 لاکھ روپے بٹور رہے ہیں۔ پی آئی اے سرکاری بنکوں اور خود مختار اداروں کے اعلیٰ افسران سرکاری مراعات اور تنخواہوں کی صورت میں کروڑوں روپے ہتھیا رہے ہیں مگر ان محکموں کی کارکردگی انتہائی مایوس کن ہے۔ مثلاً بہاولپور کے قائداعظم سولر انرجی پراجیکٹ میں چیف ایگزیکٹو آفیسر کی تنخواہ 13 لاکھ روپے ماہوار ہے جبکہ سرکاری گریڈ کے لحاظ سے وہ محض ڈیڑھ لاکھ روپے ماہوار کے حق دار ہیں۔

پی آئی اے، واپڈا، کراچی سٹیل مل ریلوے زبردست خسارے کا شکار ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے حکمران ان محکموں میں اپنے نا اہل اور کرپٹ عزیز و اقارب کو پرکشش پوسٹوں پر تعینات کروا دیتے ہیں جو نہ صرف لاکھوں روپے تنخواہوں اور مراعات کی صورت میں وصول کرتے ہیں بلکہ کروڑوں اربوں کا غبن کرنے کو اپنا استحقاق سمجھتے ہیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ قانون کی گرفت میں آ بھی گئے تو نیب سے پلی بارگین کرنے کے بعد رہا ہو جائینگے۔ چاہے وہ ڈبل شاہ ہو ایڈمرل منصور الحق ہو، جنرل زاہد علی اکبر ہو یا مشتاق رئیسانی، وہ اربوں کی لوٹ مار کرنے کے بعد چند کروڑ قومی خزانے کو واپس کر کے دوبارہ معززین میں شمار ہونے لگتے ہیں جبکہ سپریم کورٹ کے ایک اعلیٰ جج نے ریمارکس دیئے کہ ڈھائی سو روپے کی کرپشن کرنے والا چپراسی جیل کی سلاخوں میں چلا جاتا ہے جبکہ اربوں روپوں کی کرپشن کرنیوالے لٹیرے رشوت اور بدعنوانی کا 25 فیصد ادا کر کے باعزت بری ہو جاتے ہیں۔ سندھ حکومت میں ایسے تمام کرپٹ افراد دوبارہ سرکاری ملازمتوں پر بھی بحال ہو چکے ہیں تاکہ دوبارہ سرکاری خزانے کی لوٹ مار کر کے اپنے نقصان پورا کر لیں۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ تم سے پہلے قومیں اسلئے تباہ ہوئیں کہ جرم کرنے پر امراء کو چھوڑ دیتی تھیں اور غریبوں کو پکڑ لیتی تھیں۔ آج ہمارے ملک کے لوگوں کے درمیان کرپٹ اور بدعنوان لوگ پوری آن بان کیساتھ رہتے ہیں مگر کوئی شخص بھی ان بے ایمان لوگوں کا سماجی بائیکاٹ نہیں کرتا ہے۔ لہٰذا بحیثیت مجموعی معاشرے میں لوگوں کی اکثریت کی روش بن چکی ہے کہ وہ رشوت خوروں اور ناجائز طریقوں سے مال بنانے والوں سے نفرت نہیں کرتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے سوشل میڈیا پر یہ پوسٹ بھیج کر ہمارے حکمرانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے ”ایڈمرل منصور الحق پاکستان نیوی کے سربراہ تھے۔ یہ 10 نومبر 1994ء سے لے کر یکم مئی 1997ء ہمارے ملک کے نیول چیف رہے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان پر 300 ارب روپے کی کرپشن کا الزام لگا انہیں نوکری سے برخاست کر دیا گیا اور انکے خلاف تحقیقات شروع ہو گئیں جس پر منصور الحق 1998ء سے ملک سے فرار ہو کر امریکی ریاست ٹیکساس کے شہر آسٹن میں پناہ گزیں ہو گئے اور ملک میں انکے خلاف مقدمات چلتے رہے۔

اس دوران امریکہ میں انٹی کرپشن قوانین پاس ہو گئے جس پر نیب نے امریکی حکومت کو خط لکھا اور وہ 17 اپریل 2001ء کو امریکہ میں گرفتار ہو گئے اور ان کیخلاف مقدمہ درج کر لیا گیا۔ انہیں جیل میں عام قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا وہ قیدیوں کا لباس اور سیلپر پہنتے تھے اور چھوٹی سے بیرک میں قید تھے ۔ اور انہیں ہتھکڑی لگا کر عدالت لایا جاتا یہ ناروا سلوک ایڈمرل منصور الحق برداشت نہ کر سکے اور امریکی حکومت کو لکھ کر دے دیا کہ انہیں حکومت پاکستان کے حوالے کر دیا جائے امریکی جج نے یہ درخواست منظور کر لی اور انہیں ہتھکڑی لگا کر جہاز میں سوار کر دیا گیا اور سفر کے دوران بھی ان کا ایک ہاتھ سیٹ سے بندھا رہا۔ مگر جب وہ پاکستان کی حدود میں داخل ہوئے تو انکی ہتھکڑی کھول دی گئی وہ آئی پی لاؤنج سے ائرپورٹ سے باہر آئے نیوی کی شاندار گاڑی میں بیٹھ سہار ایسٹ ہاؤس پہنچے۔ سہالہ ریسٹ ان کیلئے سب جیل بنا دیا گیا۔ انہیں خانساماں بھی مہیا کر دیا گیا۔ بیگم اور اہل خانہ کو ملاقات کی اجازت دیدی گئی۔ وہیں پر عدالت لگنے لگی۔ انہوں نے پلی بارگینگ کے ذریعے لوٹ مار کی کمائی کا 25 فیصد حکومت کو واپس کیا اور آج وہ سابق نیول چیف کے مکمل پروٹوکول کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ گالف اور برج کھیلتے ہیں شادیوں اور دیگر تقریبات میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ اب ذرا تصور کیجئے کہ ہمارا مجرم جب تک امریکہ میں تھا۔ یہ وہاں زندگی کے مشکل ترین دن گزار رہا تھا لیکن یہ جونہی ہمارے ہاں آیا تو آج تک نہ صرف وہ آزاد زندگی گزار رہا ہے بلکہ وہ زندگی کی تمام سہولتوں سے لطف اندوز بھی ہو رہا ہے۔ یہ سب مزے پاکستان کے طبقہ اشرافیہ اور طاقتور افراد کو ہی حاصل ہیں جبکہ ایک ہزار روپے کا گھاس چرانے والا اس ملک میں 25 سال تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا جاتا ہے۔ آج بھی 300 روپے سے 500 روپے کی رشوت کے الزام میں کئی کلرک جیل میں قید ہیں۔ سرکاری کالج کے ایک پرنسپل کو دو ہزار کا ٹیپ ریکارڈ خریدنے پر جیل جانا پڑا۔

وزیر داخلہ چودھری نثار نے کرپشن کیخلاف جس عزم

کا اظہار کیا ہے اس کیلئے ہر سطح پر ایک عزم کے ساتھ ساتھ عملی جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس عملی جدوجہد میں بہت سے ان اقدامات کی بھی ضرورت ہے جسے ہر آنے والی حکومت نے پس پشت ڈال دیا۔ ''احتساب، جوابدہی اور مواخذہ'' تین بنیادی اصول کرپشن کے خاتمے میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس وقت ہماری ضرورت نیب جیسے ایڈہاک قسم کے''عدلِ جہانگیری'' کی نہیں بلکہ ایسے سیاسی اور سماجی پروسیز کی ضرورت ہے کہ جس کے تحت قانون کے غیر شخصی تصور اور قواعدوضوابط کے بارے میں ہمارا شعور پختہ ہو کر ہماری تہذیبی روایت کا حصہ بن سکے۔ یہ تبھی ممکن ہوتا ہے کہ جب سیاسی عمل میں مصنوعی انداز میں رخنے ڈالنے کی روایت ختم ہو جائے اور عدلیہ کو مزید فعال بنا کر ہرقسم کے سیاسی دباؤ سے آزاد کر دیا جائے ۔لیکن ان محرکات کو اگر ہم پس پشت ڈال کر کرپشن سے پاک معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں تو اس کا نتیجہ وہی نکلے گا جو گزشتہ ساٹھ سالوں سے ہمارے سامنے ہے۔ جن کا فائدہ نہ پہلے کبھی ہوا نہ آگے چل کر ہو گا۔

نظامِ عدل کی ناکامی،جمہوری اداروں کی شکست و ریخت کی وجہ سے پاکستان میں قدرتی وسائل کے باوجود بھی ہم ترقی کی اس صلاحیت سے محروم رہے ہیں جو ہم نے حاصل کرنا تھی۔ ماہرینِ سیاسیات اس بات کے معترف ہیں کہ اگر جمہوری اداروں کو ''وسیع تر قومی مفاد'' کی بھینٹ چڑھانے سے اجتناب کیا جائے تو تمام تر قباحتوں کے باوجود نہ صرف اقتصادی ترقی اور ریاست و فرد کے تعلق کو پائیدار بنیادوں پر استوار کیا جا سکتا ہے بلکہ کرپشن کے خاتمے کی طرف بھی مؤثر قدم اٹھایا جا سکتا ہے ۔ ہمارے ذہنوں میں آج بھی یہ سوال گونج رہا ہے کہ ''ملکی مسائل اور کرپشن کا ذمہ دار کون ہے؟'' اور اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں ہم نے اڑسٹھ سال گزار دیئے۔ بجائے اس کے کہ قانون کی مضبوطی، اداروں کا استحکام،جواب دہی کے اصول کے فروغ کے ذریعہ ہم کرپشن کے دروازے کو مضبوطی سے بند کرنے کے خواہشمند ہوں، ہم نے اس سوال کا حل تلاش کرنے میں اتنا عرصہ لگا دیا اور آئندہ پچاس سال بھی اسی سوال کے حل میں صرف ہو سکتے ہیں۔ اگر باقاعدہ حکمت عملی اور آزاد عدلیہ کے تصور کو مضبوط تر نہ کیا گیا ماضی سے لے کر حال تک کے تجربات نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ جب بھی کرپٹ سیاستدانوں کو لگام ڈالنے کے لئے تجاویز سامنے آتی ہیں تو آئین ساز اداروں کو داخلی طور پر فعال بنانے کی بجائے ایک ایسے عہدے پر توجہ دی جاتی ہے جو اوپر سے خدائی احکامات نازل کر سکے۔ چنانچہ "Check & Balanc"کا اصول کہیں گڈمڈ ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایک تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ نیک اعمال کی تلقین یا خطبوں سے نہ تو سیاسی انتشار کو ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کرپشن فری معاشرے کا قیام ممکن ہے۔ اس کے لئے عملی طور پر چند اقدامات کی ضرورت ہے جن میں ایسے پروسیز کا قیام کہ جس کے تحت قانون کی بالادستی قائم کرنے میں مدد مل سکے اور دوسرے ایسے پروسیز جوکہ جمہوری طرز کی طرف لے جائیں۔ یاد رکھنے کی بات تو یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک پراسیس کا فقدان عدم استحکام کا باعث بن سکتا ہے۔ مثلاً بھارت میں چھ دہائیوں سے جمہوریت قائم ہے مگر وہاں قانون کی بالادستی کا شعور پختہ نہیں ہے لہٰذا بھارتی جمہوریت نے نہرو سے لے کر لالو پرشاد اور جے للیتا جیسے سیاستدان پیدا کئے۔ جمہوریت کی آڑ میں جرائم پیشہ اور کرپٹ عناصر کا اقتدار میں آ جانا خود جمہوریت کی زندگی کیلئے خطرہ ہے۔ گزشتہ ساٹھ سالوں میں کسی ایسے ملک کی مثال نہیں دی جا سکتی جو قانون کی بالادستی اور جمہوریت کا راستہ اپنانے کے باوجود ترقی نہ کر سکا ہو۔ جبکہ ہم افریقہ، لاطینی امریکہ اور ایشیا کے بہت سے ایسے ممالک کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ ایک بات یاد رہے کہ جب فرد ریاست ہو جائے تو پھر قوانین کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ جمہوریت کے ساتھ خودمختار اور فعال عدلیہ ہی فرد اور ریاست کے درمیان اعتماد بحال کر سکتی ہے۔ جواب دہی اور مواخذے کا اصول ہی کرپشن سے نجات کا راستہ ہو سکتا ہے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ جمہوریت خاص معاشرتی ماحول میں لابنگ کے ذریعہ لوگوں کو ساتھ ملانے کا نام نہ ہو بلکہ اس معاشرے کی بنیاد رکھی جا سکے جہاں"Free Rule Context" کے ذریعہ کام کرنے کی روایت مضبوط ہو۔

§§§